چلچلاتی گرمی تھی اور سڑک دور، دور تک سنسان نظر آ رہی تھی۔ گرمیوں کی اس تپتی دوپہر کو گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے تیمور علی، کرن کے متعلق سوچ رہے تھے۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے کہ گاڑی کا اے سی خراب تھا اور پچھلے تین دن سے دادا جان کی بیماری کی وجہ سے وہ گاؤں میں تھے۔ اور اسے ہی گاؤں آتے ہوئے راستے میں ہی خراب ہوا تھا۔

''شہر پہنچتے ہی سب سے پہلا کام گاڑی ورکشاپ بھجوانے کا کروں گا......'' انہوں نے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے، رکھے دوسرے ہاتھ کی پشت سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ بہت دیر سے وہ پیاس برداشت کر رہے تھے لیکن اب حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ شفیق نے پانی کی بوتل پچھلی سیٹ پر رکھ دی تھی۔ انہوں نے گاڑی روک کر پیچھے مڑ کر جھک کر بوتل اٹھائی۔

''احمق آدمی فرنٹ سیٹ پر بھی رکھ سکتا تھا.....'' بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے پانی پیا اور بوتل پاس ہی رکھی۔ پانی پیتے ہوئے انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سایہ سا ان کی گاڑی کے قریب سے گزرا ہو۔ لیکن جب انہوں نے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے دیکھا تو دور، دور تک کوئی نہیں تھا۔ اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے انہوں نے بائیں طرف دیکھا۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر نہر تھی۔ جو اُن کے گاؤں سے اگلے گاؤں تک جا کر مڑتی تھی۔ اور عین اسی لمحے انہوں نے سفید چادر میں لپٹے ہوئے کسی شخص کو نہر میں چھلانگ لگاتے دیکھا۔ بالکل غیر اختیاری طور پر انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور تیزی سے چکر کاٹتے ہوئے نہر کی طرف دوڑے۔ کنارے پر رک کر انہوں نے دیکھا۔ چادر میں لپٹا وجود انہیں پانی میں ڈوبتا ابھرتا نظر آیا۔

تمہارے کھوج میں

digest Novels Lovers group
UUNovels.com

ناولٹ

دوسرے ہی لمحے وہ نہر میں چھلانگ لگا چکے تھے۔ اس ڈوبتے ابھرتے وجود کو سنبھالتے ہی انہیں احساس ہوا کہ یہ تو کوئی لڑکی تھی۔ جان بچانے کی لاشعوری کوشش میں وہ ان سے لپٹ گئی تھی۔ اس طرح کہ انہیں سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ وہ اگر اچھے تیراک نہ ہوتے تو شاید خود بھی ڈوب جاتے۔ وہ زمانۂ طالب علمی میں تیراکی کے کئی مقابلے جیت چکے تھے۔ انہوں نے اس کے بالوں سے پکڑ کر اسے دو تین جھٹکے دیے تو اس کی ان پر گرفت کمزور پڑ گئی اور وہ اسے لیے کنارے کی طرف تیرنے لگے۔ لڑکی کو زمین پر ایک طرح سے پٹختے ہوئے وہ کچھ دیر سانس درست کرتے رہے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسے یونہی تپتی زمین پر چھوڑ کر چلے جائیں۔ یا پھر نہر میں واپس دھکا دے دیں۔ انہوں نے تاسف سے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا جن سے پانی نچڑ، نچڑ کر نیچے زمین پر گر رہا تھا۔

''یہ لڑکی اگر مرنا چاہتی تھی تو آخر مجھے کیا ضرورت پڑی تھی اسے بچانے کی۔ میری بلا سے مر جاتی۔'' انہوں نے کوفت سے اسے دیکھا۔ پاؤں پر نظر پڑی تو مزید بیزار ہوئے کہ پانی میں بھیگ کر ان کے قیمتی سینڈل تباہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک نظر اس بے ہوش لڑکی پر ڈالی۔

زمین آگ کی طرح تپ رہی تھی اور دھوپ کی تپش ناقابلِ برداشت...... اس ناگہانی آفت پر دل ہی دل میں جھنجلاتے ہوئے انہوں نے اسے فرسٹ ایڈ دی۔ لیکن وہ پھر بھی ہوش میں نہیں آئی۔ اگرچہ جو پانی اس کے اندر گیا تھا وہ انہوں نے نکال دیا تھا۔ سیدھا ہوتے ہوئے انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ دور نزدیک کسی کے آثار نہ تھے۔ مجبوراً انہوں نے اسے اٹھایا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ مارے غصے اور کوفت کے ان کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور تیوریوں پر بل پڑ رہے تھے لیکن چاہنے کے باوجود بھی وہ اسے یوں...... بے یار و مددگار موت کے منہ میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے، یہ ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ بظاہر وہ جتنے بھی جھنجلا رہے تھے۔ فطرتاً وہ ایک نیک دل اور ہمدرد انسان تھے۔ ایک لمحے کے لیے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ واپس گاؤں چلے جائیں۔ لیکن جس طرح وہ دادا جان کو کسی حد تک ناراض چھوڑ کر آئے تھے انہیں مناسب نہیں لگا کہ وہ واپس جائیں، وہ بھی ایک بے ہوش لڑکی کو چھوڑ کر جس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ اور پھر شاید وہاں اسے ٹھیک سے طبی امداد بھی نہ مل سکے تو بہتر ہے کہ شہر ہی چلا جائے اور وہ بھی ڈاکٹر داؤد کے کلینک میں۔ جہاں انہیں سوال جواب پوچھے جانے کا ڈر نہیں تھا کہ ڈاکٹر داؤد نہ صرف اسفند بھائی کے کولیگ تھے بلکہ اچھے دوست بھی تھے۔ دونوں نے ایک ہی کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی تھی اور پھر کچھ عرصہ ایک ہی اسپتال میں کام بھی کیا تھا۔ پھر وہ تو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلے گئے تھے جبکہ ڈاکٹر داؤد نے اپنا کلینک بنا لیا تھا۔ پھر وہ سیدھے اسے ڈاکٹر داؤد کے کلینک میں ہی لے آئے۔ اور ساری واردات بیان کی۔ ڈاکٹر داؤد نے اس کا چیک اپ کیا۔

''خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، تم نے ابتدائی طبی امداد تو دے ہی دی تھی۔ سانس بھی کافی بہتر ہے، کچھ دیر میں یہ محترمہ ہوش میں آ جائیں گی۔'' ڈاکٹر داؤد نے اسے انجکشن لگاتے ہوئے کہا تو ملک تیمور علی نے اطمینان بھری سانس لی۔

''آپ اسے یہاں ہی ایڈمٹ کر لیں۔ جب یہ ہوش میں آ جائے گی تو مجھے انفارم کر دیں، میں اس کا اتا پتا پوچھ کر اسے اس کے گھر پہنچا دوں گا۔''

''تیمور یہ خودکشی کا کیس ہے۔'' ڈاکٹر داؤد نے ان کی طرف دیکھا۔

''تو......؟'' ملک تیمور نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر داؤد کی طرف دیکھا۔

''بھئی میں کسی اسپتال میں لے جانے کے بجائے اسے یہاں کیوں لایا ہوں تاکہ کسی جھمیلے میں نہ پڑنا پڑے۔''

''اوکے یار...... لیکن میں یہاں ایڈمٹ نہیں کر سکتا...... قریب ہی ایک بس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے پہلے ہی میرے اس چھوٹے سے کلینک کے چاروں کمرے بھرے پڑے ہیں۔ ابھی مزید زخمی لائے جا رہے ہیں، ایمرجنسی میں بھی زیادہ دیر نہیں رکھ سکتا۔ تم نے شاید غور نہیں کیا کتنے سارے معمولی زخمی کاریڈور میں بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر احمد اور ڈاکٹر اعجاز کو میں نے بلایا ہے، وہ آنے ہی والے ہوں گے۔'' ڈاکٹر داؤد نے وضاحت

کی تو تیمور ملک سنجیدہ ہو گئے۔

"میں نے محض انسانی ہمدردی کے تحت اسے بچایا ہے اور میں کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آپ جانتے ہیں اعجاز احمد کے پیٹ میں کوئی بات نہیں رہتی اور اس کے بڑے بھائی پولیس میں ہیں۔" ڈاکٹر اعجاز احمد سے ان کی اچھی سلام دعا تھی۔

"تو اس کا ایک ہی حل ہی ہے کہ تم اسے گھر لے جاؤ.....اول تو یہ خود بخود ہوش میں آجائے گی۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو تم مجھے فون کر دینا میں آجاؤں گا......"

"مگر......مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ جھنجلائے۔

"پھر اور کیا صورت ہو سکتی ہے تم ہی بتاؤ......"

ڈاکٹر داؤد کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھیں۔

"یہ کہ اسے دوبارہ جا کر نہر میں پھینک دوں......"

وہ مزید جھنجلائے اور کلائی الٹ کر وقت دیکھا۔

واٹر پروف واچ بھیگنے کے باوجود صحیح وقت بتا رہی تھی۔ انہوں نے گھر جا کر اپنا لباس تبدیل کرنا تھا اور پھر کرن کو لینے جانا تھا جو بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی ہوگی۔ گاؤں سے روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے اسے فون کیا تھا کہ وہ تیار رہے وہ سیدھے اسے لینے آئیں گے۔ وہ بہت اداس ہو رہی تھی اور خود وہ بھی اس کے لیے بے حد اداس ہو گئے تھے۔

گاؤں جانے سے پہلے وہ اسے اس کی نانو کے گھر پہ چھوڑ گئے تھے، وہ نانو کے گھر جا کر بہت خوش ہوتی تھی۔ لیکن اس بار اس کا موڈ نہیں تھا جانے کا......وہ ان کے ساتھ گاؤں جانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اسے ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتے تھے اگرچہ دادا جان کی بیماری کا سن کر وہ وہاں جا رہے تھے لیکن جانتے تھے کہ کسی نہ کسی نے ان کی شادی خانہ آبادی کا ذکر ضرور کرنا ہے اور کرن خواہ مخواہ ڈسٹرب ہوگی۔ اور اب یہ مصیبت ان کے گلے آ پڑی تھی۔

وہ آخر اس لڑکی کو کہاں لے کر جائیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً ڈاکٹر داؤد کی بات ماننا پڑی اور اسے گھر لے آئے۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ یوں ہی بے سدھ پڑی تھی۔ گاڑی سے نکل کر انہوں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر اسے اندر گھر میں لے جانے کے بجائے انیکسی میں لے جانے کا فیصلہ کیا اور بمشکل اسے گاڑی سے نکال کر انیکسی تک پہنچایا۔ غنیمت تھا کہ چوکیدار گیٹ کے باہر اسٹول بچھائے بیٹھا تھا۔ اور ان کے گاڑی اندر لے جانے کے بعد وہ پھر گیٹ بند کر کے باہر ہی بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس نے غور نہیں کیا ویسے بھی گاڑی کے ٹنٹڈ گلاسز تھے۔ لڑکی کو بیڈ پر لٹا کر وہ باہر آئے اور مہراں کی طرف دیکھا جو گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر گھر کا داخلی دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی اور اب اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

"مہراں......" انہوں نے اسے بلایا۔ اور انیکسی میں آنے کا اشارہ کیا۔ مہراں نے آ کر حیرت سے بستر پر لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور پھر انہیں۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ اسے اس لڑکی کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئے۔ اپنے بیڈروم میں آئے وارڈروب سے کپڑے نکالے اور شاور لے کر کپڑے تبدیل کیے پھر کرن کو فون کیا کہ کچھ تاخیر ہو گئی ہے کسی وجہ سے لیکن وہ اب اسے لینے آ رہے ہیں۔ کرن کو فون کرتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ کہیں ہوش میں آ کر لڑکی کوئی گڑبڑ نہ کر دے اور ان کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر دے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خودکشی کا کوئی نیا طریقہ ڈھونڈ لے اور وہ خود بھی پھنس جائیں۔ سو وہ بڑی تیزی سے انیکسی کی طرف آئے تاکہ مہراں کو اس کے متعلق ہدایات دے سکیں۔ مہراں سمجھدار تھی۔ وہ یقیناً ایسا ہی کرتی جیسا وہ کہہ کر جاتے۔ مہراں کو دادا جان نے گاؤں سے کرن کی خاطر بھجوایا تھا۔ اور وہ ایک طرح سے کیئر ٹیکر بھی تھی۔ دوسرے ملازمین سے اپنی نگرانی میں کام کرواتی۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکی ہوش میں آ جائے تو وہ اسے اس کے گھر پہنچا دیں۔ اور تب تک کے لیے وہ اسے مہراں کی نگرانی میں چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کمرے میں قدم رکھا۔ مہراں کمرے میں نہیں تھی۔ لڑکی اسی طرح بیڈ پر پڑی تھی جیسے وہ لٹا کر گئے تھے۔

"مہراں......" انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مہراں کو آواز دی......اسی لمحے لڑکی کراہی اور اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔ وہ غیر ارادی طور پر اس کے بیڈ کے قریب آ کر تھوڑا سا جھکے۔

"لڑکی کون ہو تم......؟ ہوش میں آ جاؤ......"

urdunovels.com

انہوں نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔
اجنبی آواز سے لڑکی کچھ بے چین ہوئی اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنی طرف جھکے ہوئے اس انتہائی وجیہہ شخص کو دیکھا۔ کچھ دیر خالی، خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اچھل کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔
''آپ کون ہو......؟'' اس کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔
تیمور علی جواب دیے بغیر گہری، گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اس کے گیلے کھلے بال اس کے چہرے پر گر رہے تھے اور اس کی آنکھیں کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح سہمی، سہمی سی تھیں۔ پھر دونوں ہاتھوں سے بال پیچھے کرتے ہوئے اس کی نظر اپنے بھیگے کپڑوں پر پڑی تو کچھ یاد آیا۔
''کیوں لائے ہو آپ مجھے یہاں......کیوں ڈوبنے نہیں دیا۔'' وہ تیزی سے بیڈ سے اتری جیسے باہر بھاگ جانا چاہتی ہو لیکن تیمور علی اس کے سامنے چٹان کی طرح کھڑے تھے۔
''ہٹیں راستے سے...... مجھے جانے دیں...... نہیں زندہ رہنا مجھے۔'' وہ انہیں دھکیلنے لگی اس پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ ان کے سینے پر مکے مار رہی تھی۔ تیمور علی اس کی اس حرکت پر لمحہ بھر کے لیے ششدر رہ گئے لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ اپنے ہاتھ ان کی مضبوط گرفت سے چھڑانے میں ناکام رہی تو پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ تیمور علی نے بوکھلا کر اسے بیڈ پر دھکیل دیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی یوں ہی روتی رہی۔
''لڑکی...... بند کرو یہ سوانگ...... گھر کی دہلیز پھلانگنے سے پہلے کچھ سوچا ہوتا تو یہ نوبت نہیں آتی.... بہرحال اب اٹھو تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں......'' انہوں نے انتہائی کوفت سے کہا۔
''جی......'' اس کی سسکیاں رک گئیں اور وہ غیر یقینی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔
''کیا میرے سینگ نکل آئے ہیں جو یوں آنکھیں پھاڑ رہی ہو...... اٹھو پہلے ہی میرا بہت وقت ضائع ہو گیا ہے۔'' تیمور علی کے لہجے کی سختی سے وہ خوفزدہ ہو گئی۔
''میں خود ہی چلی جاؤں گی آپ زحمت نہ کریں۔''
''زحمت میں تو تم نے مبتلا کر ہی دیا ہے۔'' ان کے لہجے میں سختی کے ساتھ، ساتھ بیزاری اور چڑچڑا پن تھا۔ وہ ایسے نہیں تھے لیکن دادا جان سے بحث و مباحثے نے انہیں چڑچڑا کر دیا تھا۔
''گھر کا پتا بتاؤ سیدھی طرح......''
''میں......میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔
''تو کیا درختوں پر بسیرا تھا تمہارا یا کہیں غاروں میں رہتی تھیں ؟'' انہیں اس پر تاؤ آ رہا تھا۔
''خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔'' لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
''کوئی ایسا ویسا قدم اٹھانے سے پہلے کچھ سوچ لیا ہوتا تو آج مرنے کی نوبت نہیں آتی۔'' ان کے لہجے کی تلخی اور کاٹ نے اسے تڑپا دیا۔
''کیسا قدم، کیا سمجھ رہے ہیں آپ؟''
''مر جانے سے کھوئی ہوئی عزت واپس نہیں آتی بی بی اور نہ ہی رسوائی کا وہ داغ دھل سکتا ہے جو تم اپنے والدین کی عزت پر لگا آئی ہو......'' انہوں نے جیسے اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔
''خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں، آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔'' آنکھوں سے آنسو نکلنے کو بے تاب ہوئے تھے۔
''تو پھر ایسا کیا جرم کیا ہے جو اس انتہائی قدم پر مجبور ہو گئیں۔'' انہوں نے اس کے آنسوؤں سے نظریں چرائیں۔
''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔
''او کے، مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ تم کیوں نہر میں کودی تھیں۔ لیکن اب یہ میری ذمے داری ہے کہ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں...... پھر بھلے تم وہاں سے دوبارہ بھاگ جانا، چلو اٹھو۔'' انہوں نے اسے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سوچا کہ وہ پھر کرن کو فون کر دیں کہ وہ لیٹ ہو جائیں گے۔
''میں سچ کہہ رہی ہوں کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔
''میں کیسے مان لوں کہ تم نے اب تک کی ساری زندگی کھلے آسمان تلے گزاری ہے۔'' انہوں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں......" اس نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔

"کوئی ضرورت نہیں مجھے یقین دلانے کی۔" اس کی ہٹ دھرمی پر انہیں غصہ آگیا تھا۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے جو تمہاری منتیں کرتا پھروں...... مجھے ایک کام سے جانا ہے، میرے آنے تک سوچ لو اچھی طرح سے گھر کا پتا بتانا ہے یا نہیں...... پھر بھی اگر تمہارا یہ ہی جواب ہوا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گا وہ خود ہی تم سے معلوم کرلیں گے سب کچھ......" انہوں نے کمرے سے باہر نکل کر باہر سے دروازہ لاک کردیا۔ مہراں پانی کا گلاس لیے آرہی تھی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں، میں تمہیں اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر گیا تھا۔"

"جی، وہ یہ لڑکی بے ہوشی میں پانی مانگ رہی تھی تو پانی لینے چلی گئی تھی۔ اندر جا کر خیال آیا کہ بٹ چاچا باہر جانے سے پہلے مجھے ہانڈی دیکھنے کا کہہ کر گئے تھے تو ذرا دیر کے لیے کچن میں چلی گئی تھی کہ چولھا بند کرآؤں......" مہراں نے تفصیل سے بتایا اور وہ اسے ڈانٹتے، ڈانٹتے رہ گئے۔

"خیر اب دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں......"

"لیکن صاحب جی یہ ہے کون؟" مہراں کو تجسس ہوا۔

"پتا نہیں، نہر میں کود رہی تھی میں نے بچا لیا...... بدقسمتی سے نظر پڑ گئی تھی اس پر اب بھگت رہا ہوں، خیر کرن کو لے آؤں تو پھر دیکھتا ہوں کیا کرنا ہے۔ گھر کا پتا نہ بتایا تو کسی شیلٹر ہوم چھوڑ آؤں گا۔"

مہراں پرانی اور خاندانی ملازمہ تھی سو سچ بتا دیا۔

"جانے غریب پر کیا افتاد پڑی۔" مہراں نے آہ بھری۔

"میں کرن کو لینے جارہا ہوں تب تک تم انیکسی میں ہی رہو...... اور بیڈروم کا دروازہ باہر سے ہی بند ہی رکھنا وہ کہے بھی تو نہیں کھولنا۔ میں آکر دیکھتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔"

وہ اسے ایک بار پھر اس کا دھیان رکھنے کی تاکید کر کے چلے گئے۔ خیال تھا کہ جلد ہی کرن کو لے کر واپس آجائیں گے اور پھر مہراں سے کہیں گے کہ وہ نرمی اور محبت سے اس سے معلوم کرے کہ گھر کہاں ہے اس کا اور کیوں گھر سے بھاگ کر اپنی جان لینے چلی تھی۔ لیکن وہاں جا کر اور کرن سے مل کر وہ کچھ دیر کے لیے بھول ہی گئے کہ وہ ایک لڑکی کو کمرے میں بند کر کے آئے ہیں۔ پھپھو نے انہیں اصرار کر کے کھانے پر روک لیا تھا۔ اور کھانا کھانے کے بعد تیمور علی کو کرن کے ماموں سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے کافی دیر ہوگئی تھی۔ واپسی پر کرن کی معصوم باتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ بہت سکون سے ڈرائیو کررہے تھے کہ اچانک انہیں اس لڑکی کا خیال آگیا۔

"اوہ مائی گاڈ......" ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"کیا ہوا بابا......؟" کرن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں میری جان...... ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔" انہوں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی۔ "بیچاری لڑکی صبح سے بھوکی پیاسی کمرے میں بند ہے۔" ان کے اندر جذبۂ ترحم جاگا۔

"کہیں اس نے کوئی ہنگامہ نہ کردیا ہو...... ملازمین کیا سوچتے ہوں گے۔"

مہراں ہارن کی آواز سن کر انیکسی سے باہر نکل کر کھڑی ہوگئی تھی۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا تو وہ گاڑی اندر لے آئے۔ اتر کر مہراں کے قریب آئے۔

"سب ٹھیک ہے ناں...... شور تو نہیں مچایا اس نے؟"

"نہیں......" مہراں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے کرن کو اس کے حوالے کیا۔

"اسے لے جاؤ مہراں میں بھی آتا ہوں...... اور......" وہ کرن کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اب کارٹون دیکھنے مت بیٹھ جانا۔ چینج کر کے بیڈ پر چلی جانا۔ صبح اسکول بھی جانا ہے، آج رضوانہ آپی سے کوئی کہانی بھی نہیں سننی......"

"جی بابا......"

وہ خود بھی تھکی ہوئی تھی۔ جب بھی وہ نانو کے گھر جاتی ماموں زاد بہن بھائیوں سے خوب کھیلتی تھی اور بہت خوش رہتی تھی کہ یہاں تو وہ اکیلی تھی...... اور کوئی کھیلنے والا نہیں تھا سو نانو کے گھر جا کر خوب کھیلتی اور خوب تھک جاتی۔ مہراں، کرن کو لے کر چلی گئی تو وہ سیدھے انیکسی کی طرف گئے۔ دروازہ کھولا۔ اندر بیڈروم میں تاریکی تھی۔ وہ اس تاریکی سے خوفزدہ ہوگئے۔ اگرچہ انیکسی کے

برآمدے میں لائٹ جل رہی تھی۔ جس کی روشنی بیڈروم کا دروازہ کھلنے پر اندر تک آ گئی تھی۔ اندر ایک غیر فطری سی خاموشی کا احساس ہوا تھا انہیں جیسے وہاں کوئی ذی روح نہ ہو۔ انہوں نے دروازے کے دائیں طرف موجود بورڈ پر ہاتھ رکھا اور سوئچ دبایا۔ کمرا روشنی سے جگمگا اٹھا.... وہ بے ترتیب سی زمین پر پڑی تھی۔ ایک مبہم سا خدشہ دل میں جاگا اور انہوں نے بے اختیار جھک کر اسے دیکھا اس کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ سانس جیسے رک، رک کر آ رہی تھی، نبض دیکھی تو ڈوبتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ گھبرا کر انہوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا لیکن بے سود اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں کو رگڑ، رگڑ کر گرم کرنے کی کوشش کی پھر اٹھا کر اسے بیڈ پر ڈالا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں...... پریشانی میں انہیں ڈاکٹر داؤد کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔

"اگر یہ مر گئی تو...... میں تو اسے جانتا تک نہیں...... کیا یہ موت کی خنکی ہے۔" اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے سوچا۔ اور ایک دم ہی انہیں ڈاکٹر داؤد کا خیال آیا۔

"اوہ میرے خدا......" ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے انہوں نے جیب سے فون نکالا۔

"آپ کہاں ہیں ڈاکٹر داؤد......؟" ان کی ہیلو سنتے ہی انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

"گھر جا رہا ہوں راستے میں ہوں...... کچھ دیر آرام کر کے پھر جاؤں گا...... ابھی ڈاکٹر احمر وغیرہ ہیں وہاں زیادہ سیریس زخمیوں کو تو میو اسپتال بھجوا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر گھر جانے سے پہلے ادھر چکر لگا لیں۔ لڑکی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔" ڈاکٹر داؤد بھی اسی کالونی میں رہتے تھے۔ انہوں نے اطمینان بھری سانس لی کہ یقیناً وہ دس، پندرہ منٹ تک پہنچ جائیں گے۔ فون بند کر کے وہ مہراں کو بلا کر لے آئے۔

"مہراں تم اس کے پاس بیٹھو...... یہ ہوش میں نہیں آ رہی ہے۔ ابھی ڈاکٹر داؤد آ رہے ہیں۔"

مہراں اس کے پاس بیٹھ کر اس کے تلوے رگڑنے لگی اور وہ ڈاکٹر داؤد کے انتظار میں گیٹ کے قریب ہی ٹہلنے لگے مگر انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، ڈاکٹر داؤد جلدی آ گئے تھے۔

"کیا یہ بالکل ہوش میں نہیں آئی......؟" انہوں نے اسے چیک کیا۔

"نہیں، ہوش تو آ گیا تھا تب...... پھر میں کرن کو لینے چلا گیا۔ واپس آیا تو یہ فرش پر گری ہوئی تھی۔" انہوں نے بتایا تو ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے انہیں دوا انجیکشن منگوانے کو کہا۔

مہراں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے فوراً ٹیلیفون ڈائری اور بال پین نکال کر انہیں دیا۔ انہوں نے لکھ کر کاغذ پھاڑ کر انہیں دیا۔

"میرے ڈرائیور کو ہی بھیج کر منگوا لو...... چوک والا میڈیکل اسٹور کھلا ہے۔ میں نے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے یہ بے ہوشی نقاہت اور اسٹریس کی وجہ سے ہے۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔" انہوں نے تیمور علی کو بتایا جواب بھی پریشان سے کھڑے تھے۔

"بیٹھ جاؤ یار پریشان مت ہو...... دیکھ لیں گے صبح...... اب رات کو اسے ہوش بھی آ گیا تو کہاں لے کر جاؤ گے...... اگر اس نے گھر کا پتا بھی بتا دیا تو جانے اس کے گھر والے اسے قبول بھی کریں گے یا نہیں......" انہوں نے مہراں کے جانے کے بعد ڈاکٹر داؤد کو تفصیل بتا دی تھی۔

"صبح تمہاری بھابی کو ساتھ لے آؤں گا...... وہ بات کر لے گی اس سے...... شاید اسے وہ سب بتا دے جو وہ ایک اجنبی مرد کو بتاتے ہوئے جھجک رہی ہے۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

مہراں نے انجیکشن لا کر انہیں دیے تو انہوں نے ایک انجیکشن لگایا۔ کچھ دیر بعد وہ کسمسائی اور اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن پھر فوراً ہی بند کر لیں۔

"یہ ہوش میں آ رہی ہے۔" تیمور علی نے جو مسلسل اس کی طرف دیکھ رہے تھے ڈاکٹر داؤد کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

"ابھی کچھ دیر تک یہ مکمل ہوش میں آ جائے گی تو پھر گرم دودھ کے ساتھ کچھ کھلا دیجیے گا۔ ایک آدھ سلائس یا رسک کچھ بھی۔" ڈاکٹر داؤد نے مہراں کی طرف

دیکھا تو وہ دودھ لینے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”میں کہاں ہوں؟“ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

”میں ڈاکٹر داؤد ہوں اور یہ تیمور آپ کو یہاں لائے ہیں۔ آپ بے ہوش تھیں۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ......؟“

”پتا نہیں ڈاکٹر صاحب لیکن مجھے جانا ہے۔“

”دودھ پی لیں، لگتا ہے آپ نے بہت دیر سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ پھر جہاں جانا چاہو ہم چھوڑ آئیں گے آپ کو......“ ڈاکٹر داؤد کے لہجے میں نرمی اور شفقت تھی۔

”نہیں......“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”مجھے کچھ کھانا پینا نہیں ہے...... بھوک نہیں ہے مجھے......“

”اچھا......“ ڈاکٹر داؤد مسکرائے۔

”پھر یہ بے ہوشی کس وجہ سے تھی۔ کمزوری اور بھوک کی وجہ سے تو بہتر ہے کہ کچھ کھا پی لو تاکہ جہاں جانا ہے جا سکو...... کچھ طاقت ہوگی جسم میں تو تب ہی جانے کے قابل ہو سکو گی......“

”ڈاکٹر صاحب صحیح کہہ رہے ہیں بیٹی...... صبح سے بھوکی پیاسی پڑی ہو......“ مہراں دودھ کا بھرا کپ لے کر آ گئی تھی ساتھ میں بریڈ سلائس بھی تھے۔ اس نے مہراں کے ہاتھ سے لے لیا اور گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

”بیٹی یہ سینڈوچ لے لو، کرن بے بی کے لیے بنوائے تھے لیکن وہ کھانا کھا کر آئی تھیں۔“

اس نے الجھی، الجھی نظروں سے مہراں کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”اوکے، دودھ بھی اپنی جگہ ایک مکمل غذا ہے اگر یہ کچھ نہیں لینا چاہتیں تو ٹھیک ہے رہنے دو مہراں......“

ڈاکٹر داؤد نے انجیکشن تیار کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ہی اس نے دودھ ختم کیا وہ اسے انجیکشن لگا کر کھڑے ہو گئے۔

”اوکے تیمور چلتا ہوں......“

”گھر چلیں چائے یا کافی بنواتا ہوں......“ تیمور علی بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔

”نہیں یار بہت تھکا ہوا ہوں...... ابھی مجھے ڈنر بھی کرنا ہے۔ سمیرا اور بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

انہوں نے انیکسی سے باہر نکلتے ہوئے معذرت کی۔

”تمہاری کافی اور چائے اُدھار رہی۔“

”وہ آپ نے کہا تھا کہ سمیرا بھابی......“ ان کے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے تیمور علی نے پوچھا۔

”بے فکر رہو۔ صبح کلینک جاتے ہوئے چھوڑ جاؤں گا اسے۔“ داؤد نے تیمور علی کا بازو تسلی کے انداز میں تھپتھپایا۔

”اور اگر رات کو مسئلہ ہو گیا کوئی تو......“ ان کی سوالیہ نظریں ڈاکٹر داؤد کی طرف اٹھیں۔

”کچھ نہیں ہوگا، یہ دوسرا انجیکشن سکون آور تھا۔ صبح تک سکون سے سوتی رہے گی۔ تم بے فکر ہو کر سو جانا۔“

اور ڈاکٹر داؤد نے صحیح ہی کہا تھا جب وہ واپس انیکسی میں آئے تو وہ تکیے پر سر رکھے نیم غنودگی کے عالم میں تھی۔ آہٹ پر اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولی تھیں لیکن پھر فوراً ہی بند کر لیں۔

”مہراں آج رات تم اپنا بستر اِدھر ہی بچھا لو...... اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے جگا لینا۔“

وہ مہراں کو ہدایت دے کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔

پھر جب تک وہ سوئے نہیں اسی کے متعلق سوچتے رہے۔

”پتا نہیں کون ہے، شکل صورت سے تو کسی اچھے گھرانے کی لگتی ہے۔ اب اگر اس نے سمیرا بھابی کو بھی اپنے متعلق کچھ نہ بتایا تو وہ کیا کروں۔ کیا اسے گھر سے نکال دوں۔ لیکن باہر کی دنیا ایک خوب صورت جوان لڑکی کے لیے درندوں بھرے جنگل کی طرح ہے۔ یہ انسان نما بھیڑیے تو اسے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے تو کیا اسے اپنے سر پر مسلط کر لوں۔“ وہ یونہی اس کے متعلق سوچتے، سوچتے سو گئے تھے۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا وہ بہت گہری نیند میں تھی جب اسے مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔

”تاشی، تاشی...... تاشہ......“

وہ اس وقت بہت خوشگوار خواب دیکھ رہی تھی۔ خوب صورت سی پھولوں اور سبزے سے بھری وادی، نیلگوں اور بھوری پہاڑیاں اور اونچے پہاڑوں سے بہتا ہوا پانی اور نیچے جہاں پانی گر رہا تھا وہاں کنارے پر پتھر

پر ایک پاؤں رکھے اس کی طرف دیکھتا اجنبی...... اس کے لبوں پر دلفریب سی مسکراہٹ تھی اور اس کی چاکلیٹی آنکھوں سے اپنائیت جھلکتی تھی حالانکہ وہ پہلی بار اسے دیکھ رہی تھی۔ ابھی لمحہ بھر پہلے تو یہاں کوئی نہیں تھا تو کیا وہ پہاڑوں پر قدم رکھتا ہوں آسمان سے اترا ہے۔ وہ مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھی تب ہی اسے کسی کی دبی، دبی سسکیاں سنائی دیں جیسے کوئی گھٹ، گھٹ کر رو رہا ہو اور پھر کسی کی مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔

"تاشی...... تاشی......"

پتا نہیں یہ آواز کہاں سے آرہی تھی نیچے وادی سے یا اوپر پہاڑوں سے...... پتا نہیں کون اسے آواز دے رہا تھا پھر جیسے کسی نے اس کے بازو کو پکڑ کر ہلایا تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ خواب کا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے دیکھا اماں اس کے بازو پر ہاتھ رکھے اس پر جھکی مدھم آواز میں اسے پکار رہی تھیں۔

"تاشی...... میری جان......"

ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ رو رہی تھیں۔ اس کے ذہن پر ابھی تک اس خوشگوار خواب کا اثر تھا اس لیے وہ فوری طور پر سمجھ نہ سکی کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ اور یوں ہی نیم وا آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔ لیکن جب ان کے آنسو تیزی سے بہنے لگے تو وہ پوری طرح جاگ اٹھی اور تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا اماں...... کیا بات ہے، آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں، ماموں تو ٹھیک ہیں۔"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن ان کے آنسو اور بھی روانی سے بہنے لگے تھے۔

"اماں پلیز بتائیں ناں ماموں ٹھیک ہیں۔"

دو دن سے ان کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو کیا آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں مامی کو جگاؤں......" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اماں آپ بولتی کیوں نہیں......" وہ گھبرا کر بیڈ سے اترنے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں اور بھائی صاحب بھی بالکل ٹھیک ہیں۔" انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

"پھر آپ رات کے اس پہر رو کیوں رہی ہیں؟" وہ الجھی۔

"تاشی...... میری جان......" انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کی پیشانی اور رخساروں کو چومتے ہوئے پھر زار و قطار رونے لگیں۔

"اماں خدا کے لیے کچھ تو بتائیں کیا ہوا ہے، کیا مامی نے کچھ کہا ہے؟"

اسے یاد آیا کہ رات کو ماموں نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا تھا کہ کچن سمیٹ کر وہ ان کی بات سن لیں۔ وہ دیر تک انتظار کرتی رہی تھی لیکن پھر ان کے آنے سے پہلے ہی سو گئی تھی۔

"ماموں نے آپ کو بلایا تھا۔ کیا کہا تھا انہوں نے۔"

"تمہارے ماموں اور مامی چاہتے ہیں کہ...... تاشی...... تم یہاں سے چلی جاؤ...... ابھی اسی وقت......"

"ابھی...... اس وقت......؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "اس وقت تو رات کے دو بجے ہیں۔" اس نے سامنے کلاک پر نظر ڈالی۔

"مجھ سے کیا غلطی ہوگئی ہے اماں کہ ماموں اور مامی چاہتے ہیں کہ میں اس وقت گھر چھوڑ دوں......؟"

"وہ نہیں...... میں چاہتی ہوں میری جان...... اس لیے کہ میں تمہیں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی......" آنسو پھر ان کی آنکھوں میں مچلنے لگے۔

"یہاں بیٹھیں......" اس نے بازو سے پکڑ کر انہیں پاس بٹھایا۔ "اماں پلیز مجھے ساری بات بتائیں۔"

"تاشی...... تمہارے ماموں اور مامی تمہاری شادی جواد سے کرنا چاہتے ہیں...... تمہارے ماموں نے کہا ہے کہ وہ چاہتے ہیں، اپنی یتیم بھانجی......" ان کی آواز رندھ گئی۔

"جواد سے؟" لمحہ بھر کے لیے اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بھڑک اٹھی تھی۔

"کیا میرے لیے وہ ابنارمل، نیم پاگل جواد ہی رہ گیا ہے۔ فرہاد اور فواد کی شادیاں امیر گھرانوں میں طے کرتے ہوئے انہیں اپنی یتیم بھانجی کا خیال نہیں آیا۔ یہ نہیں ہوسکتا اماں آپ ماموں کو منع کر دیں۔"

"منع کیا تھا میں نے تاشی......" وہ بے بس سی نظر

آرہی تھیں۔

"لیکن افضل بھائی اپنے احسان جتانے لگے کہ پھوپی زاد بھائی ہو کر بھی انہوں نے سگے بھائی کی طرح ہمارا خیال رکھا۔ تاشی ان کے بہت احسانات ہیں ہم پر، جب تمہارے بابا دنیا سے چلے گئے تو ہم بالکل بے یارو مددگار تھے تب افضل بھائی نے ہی ہمیں سہارا دیا تھا۔ یاد ہے ناں جب مالک مکان نے ہمارا سامان باہر پھینک دیا تھا تو افضل بھائی ہی تھے جو......"

"تو کیا آپ ان کے احسانات کا بدلہ مجھے ان کے ابنارمل بیٹے سے بیاہ کر دیں گی؟" اس نے ان کی بات کاٹی تو انہوں نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں، میں بھلا ایسا کیوں کروں گی تاشی...... میں نے انکار کیا تھا لیکن سلمٰی بھابی کہتی ہیں کہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کی شادی کر دیں تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر گھر والے ہی دھتکار دیں گے تو باہر سے بھلا کون رشتہ دے گا۔"

"اور آپ نے ان کی اس جذباتی بلیک میلنگ کے آگے مجبور ہو کر ہاں کر دی۔" اس نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"نہیں......" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے کہ تاشی کہ وہ کل ہی تمہارا نکاح جواد سے نہ پڑھا دیں۔ میں نے کمرے سے باہر آکر سنا تھا۔ سلمٰی بھابی، افضل بھائی سے کہہ رہی تھیں کہ کل ہی کسی بھی طرح جواد اور تناشہ کا نکاح پڑھا دیں...... ورنہ تاشی بہت تیز ہے گڑبڑ نہ کر دے۔"

"کیا مطلب ہے اماں...... وہ زبردستی کریں گے" میری مرضی کے خلاف...... میں کوئی جاہل، بیوقوف یا ان پڑھ لڑکی نہیں ہوں جس سے وہ زبردستی انگوٹھا لگوا لیں گے۔ میں صاف انکار کر دوں گی کہ مجھے قبول نہیں ہے، وہ صرف ابنارمل اور نیم پاگل ہی نہیں ہے بلکہ ...... کیا آپ نہیں جانتیں کیسے ماسی صفیہ کی بیٹی کو لوگوں نے اس سے بچایا تھا۔" وہ روہانسی ہوئی تھی۔

"آپ نے صاف، صاف انکار کیوں نہیں کیا اماں...... اگر انہیں اپنے احسانات کا بدلہ ہی لینا ہے تو میں جاب ملنے کے بعد ان کی پائی، پائی چکادوں گی جو انہوں نے ہم پر خرچ کی۔"

"کیا تھا...... صاف انکار کیا تھا...... لیکن افضل بھائی اور بھابی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور میں نے کہہ دیا کہ تم کبھی نہیں مانو گی...... مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کیا کہوں......" وہ پھر سے رونے لگی تھیں۔ "اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ......"

"لیکن اماں آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ایک جوان اکیلی لڑکی رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل کر کتنے ان دیکھے خطرات کا شکار ہو سکتی ہے۔ پھر لوگ کیا کہیں گے، آپ کی کتنی بدنامی ہوگی...... نہیں اماں، میں اس طرح چوروں کی طرح گھر نہیں چھوڑ سکتی۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تاشی...... ہم دو مجبور اور کمزور عورتیں...... اگر افضل بھائی نے زور زبردستی کی تو ہم انہیں کیا روک سکیں گے۔ میرا سر ان کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اور تم...... جب افضل بھائی نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑے سلمٰی بھابی نے تمہارے پاؤں پر اپنا دوپٹا ڈال دیا تو کیا کرو گی تم......؟"

"تو کیا ان کے احسانوں کا بدلہ صرف اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ میں اپنا آپ قربان کر دوں......؟" وہ جھنجلائی۔

"یا میں نے کوئی سماج سدھار مہم شروع کر رکھی ہے۔ میں صبح خود ماموں سے بات کرلوں گی......"

"نہیں، نہیں تاشی تم ایسا مت کرنا۔" وہ گھبرا گئیں۔ "میں جانتی ہوں تم میری بیٹی ہو، تم لاکھ شور مچاؤ ہزار دعوے کرو اگر افضل بھائی نے اپنی ٹوپی تمہارے پاؤں پر رکھ دی اور کہا کہ میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے...... جواد شادی کے لیے پاگل ہو رہا ہے تاشی اور سلمٰی بھابی ہر قیمت پر اس کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ تم کچھ بھی کہے بغیر چپ چاپ قربان ہو جاؤ گی......"

"شاید اماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔" تناشہ نے سوچا۔ "ماموں زور زبردستی، منت سماجت سے کچھ بھی منوا سکتے ہیں۔"

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں کسی کمرے میں بند کر کے زبردستی نکاح کے کاغذات پر دستخط کروالیں۔ اور دھمکی دے کر ہاں کروالیں۔ مثلاً مجھے مار دینے کی دھمکی......"

"اب ایسا بھی اندھیر نہیں ہے اماں......" تاشہ نے کہا لیکن اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ اندر سے جیسے اسے یقین تھا کہ اماں سچ کہہ رہی ہیں۔ دولاوارث کمزور عورتیں کسی بھی تشدد کے آگے کیسے ٹھہر سکتی ہیں۔

"لیکن رات کے اس وقت میں کہاں جاؤں گی، کون ہے ہمارا......" وہ جیسے بے بس سی ہو کر بولی۔

"علم دین سے بات کی ہے میں نے......وہ تمہیں اپنے گھر پہنچا کر صبح ہونے سے پہلے لوٹ آئے گا۔ تمہیں میں نے بتایا تھا کہ علم دین تمہارے نانا کے گھر ملازم تھا۔ دس، بارہ سال کی عمر میں ہمارے گھر آیا تھا۔ اماں جان نے ہی اسے کھانا پکانا سکھایا تھا۔ میری شادی اور اماں، ابا کی وفات کے بعد افضل بھائی نے اسے اپنے ہاں ملازمت دے دی تو بہت لحاظ کرتا ہے میرا......اس کے گھر میں اس کی ماں، چھوٹا بھائی اور بیوی بچے ہیں۔ بس کچھ دن رہنا وہاں تم پھر میں کچھ نہ کچھ سوچ لوں گی۔ کوئی راستہ نکل آئے گا تاشی......" ان کے ذہن میں کیا تھا تاشہ نہیں جانتی تھی کہ کیا راستہ نکلے گا چند دن بعد وہ علم دین کے گھر سے کہاں جائے گی۔ پھر بھی لحہ بھر کے لیے اس کے دل میں آیا کہ وہ اماں کی بات مان کر اسی وقت علم دین چاچا کے ساتھ ان کے گھر چلی جائے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔

"نہیں اماں...... میرے جانے کے بعد صبح یہاں جو قیامت اٹھے گی اس کا سامنا آپ کیسے کریں گی۔ ممانی تو آپ کو کچا ہی چبا جائیں گی۔ ان کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ آپ نے خود مجھے کہیں بھیجا ہے تو اگر مجھے کہیں جانا بھی ہوگا تو میں دن کے اجالے میں جاؤں گی۔ وہ بھی دین چاچا کے گھر نہیں...... اپنی دوست کے گھر جاؤں گی......"

"اور اگر انہوں نے تمہیں نہ جانے دیا تو؟" وہ خوفزدہ تھیں۔

"پلیز اماں...... مجھے کچھ سوچنے دیں۔ آپ تو مجھے بھی بوکھلائے دے رہی ہیں۔"

تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ علم دین تھا۔

"بی بی بہت دیر کر دی آپ نے...... جلدی چلیں، مجھے صبح ہونے سے پہلے پھر واپس بھی آنا ہے۔" وہ اوپر چھت پر بنے کمرے میں رہتا تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ چاچا، اماں تو ویسے ہی گھبرا گئی ہیں۔ مجھے اس وقت کہیں نہیں جانا اور سوری چاچا ہماری وجہ سے آپ کی نیند خراب ہوئی۔" وہ ایسی ہی تھی نڈر اور خود اعتماد اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو گھبرا کر نکل پڑتی گھر سے۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں بی بی......آپ کے نانا کے گھر کا نمک کھایا ہے، ان کی اولاد کے لیے جان بھی حاضر ہے۔" علم دین نے آہستگی سے کہا۔

"ایک بار پھر شکریہ چاچا......اب آپ جا کر آرام کریں، اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ضرور آپ سے ہی مدد لیں گے۔" اس نے دروازہ بند کر کے مڑ کر دیکھا تو اماں سر تھامے بیٹھی تھیں۔

"یوں پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا......صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ آپ آرام کریں۔" وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ حوصلہ رکھیں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے، ہم فجر کی نماز پڑھ کر گھر سے نکل جائیں گے...... یہاں تو دس بجے سے پہلے کوئی نہیں اٹھتا۔ ان کے اٹھنے سے پہلے ہی ہم چلے جائیں گے اور آپ بھی میرے ساتھ چلیں گی اور ہم علم دین چاچا کو ماموں کے لیے پیغام دے کر جائیں گے کہ ہم ان کا گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ مجھے ان کے احسانات کا اس طرح بدلہ چکانا منظور نہیں ہے، ہاں اپنے اوپر خرچ ہونے والی ان کی پائی، پائی ادا کر دیں گے۔ بلکہ بہتر ہے میں ان کے نام خط لکھ کر علم دین چاچا کو دے دوں گی......"

"لیکن ہم کہاں جائیں گے تاشو......؟"

"صبح بتاؤں گی بس آپ سونے کی کوشش کریں تا کہ تھوڑا فریش ہو جائیں......" اس نے انہیں لٹایا اور خود بھی ان کے پاس ہی لیٹ گئی اور سوچنے لگی کہ وہ...
میرپور اپنی دوست رابعہ کے گھر جائے اور وہاں چند دن نوکری تلاش کرلے یا یہاں ہی مظفرآباد میں فارحہ کے گھر چلی جائے۔ دونوں ہی اس کی اچھی دوست تھیں۔ تینوں نے دو سال ہاسٹل میں ایک ہی کمرے میں

گزارنے تھے۔ فارحہ سے اس کی دوستی کالج میں ہوئی تھی جبکہ رابعہ سے یونیورسٹی میں۔ فارحہ قائداعظم یونیورسٹی سے ماسٹر کرنا چاہتی تھیں اس نے اسے بھی مجبور کیا کہ وہ اس کے ساتھ قائداعظم یونیورسٹی سے ہی ماسٹر کرے۔ دونوں نے کیمسٹری میں ماسٹر کیا تھا۔ چھ سات ماہ پہلے ہی ان کا رزلٹ آیا تھا۔ فارحہ تو ایم فل بھی وہاں سے ہی کرنا چاہ رہی تھی لیکن اماں اسے اجازت نہیں دے رہی تھیں۔

''افضل بھائی انکار نہیں کریں گے تاشی لیکن پہلے ہی ان کے احسانات کے بوجھ سے گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ مزید بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔''

اور وہ چپ کر گئی تھی۔ فارحہ مسلسل اسے اکساتی رہتی۔ رابعہ سے ان کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی اور پھر اتفاق سے وہ ان کی روم میٹ بھی تھی۔ وہ میرپور سے آئی تھی۔ فارحہ کے گھر میں اس کی دو بڑی بھابیاں بھی تھیں۔ ایک بھائی چھوٹا تھا جو یو ای ٹی میں پڑھ رہا تھا۔ پتا نہیں ان کی بھابیوں کو ان کا اپنے گھر میں رہنا اچھا لگے یا نہیں...... رابعہ کے گھر وہ اس کی بڑی بہن کی شادی پر گئی تھی۔ اس کے اماں، ابا بہت محبت سے ملے تھے۔ اور شادی کے بعد وہ خود رابعہ کے ساتھ انہیں ہاسٹل چھوڑنے آئے تھے۔ رابعہ کو ابھی چند دن اور گھر رہنا تھا۔ وہ صرف اسے چھوڑنے آئی تھی۔ اور پھر رابعہ اب گھر میں اکیلی تھی۔ اس کے دونوں بھائی یوکے میں اپنی فیملیز کے ساتھ سیٹل تھے۔ تو یہ طے ہوا کہ انہیں رابعہ کی طرف جانا چاہیے۔ فیصلہ کر کے وہ اٹھی اور اپنے بیگ میں ضروری چیزیں رکھنے لگی۔ اپنی تعلیمی اسناد اور چند جوڑے کپڑے وغیرہ...... جتنا اس ایک بیگ میں آسکتا تھا۔ اس نے زپ بند کرتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو اماں بیڈ پر بیٹھی پریشان سی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''آپ سوئی نہیں اماں......؟''

''نہیں، نیند کیسے آسکتی ہے، تم نے کہاں جانے کا سوچا ہے۔''

''رابعہ کی طرف میرپور چلیں گے فی الحال...... آپ بھی اپنے کپڑے وغیرہ رکھ لیں۔'' اس نے بیڈ کے نیچے سے ایک اور بیگ نکالا۔

ہاسٹل میں رہنے کی وجہ سے اس نے دو تین چھوٹے بڑے سفری بیگ خرید رکھے تھے۔

''تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے تاشو، پتا نہیں ہم صحیح کر رہے ہیں یا غلط...... افضل بھائی اور بھابی کیا سوچیں گے کہ ہم کتنے احسان فراموش ہیں۔'' وہ کچھ متذبذب سی لگ رہی تھیں۔

''یہ فیصلہ تو آپ کا ہی تھا اماں کہ میں علم دین چاچا کے ساتھ چلی جاؤں...... اور میں نے تو بس یہ ہی فیصلہ کیا ہے ناں کہ میں اکیلی نہیں آپ کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

''ہاں......'' وہ کچھ متوحش اور گھبرائی، گھبرائی سی تھیں۔

''میں جواد کے ساتھ شادی کرنے سے بہتر مر جانا پسند کرتی ہوں...... اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو مار ڈالتی خود کو...... پھر بھی اگر آپ کو لگتا ہے کہ اس طرح جا کر ہم احسان فراموش کہلائیں گے تو لیں اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیں۔ وہ جذباتی ہو کر ان کے پاس نیچے فرش پر بیٹھ گئی اور ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے گلے پر رکھے۔

''لیں دبائیں اور مار ڈالیں مجھے......''

''پاگل ہو گئی ہو کیا......'' انہوں نے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

''مجھے تو خود بس یہی سمجھ آئی تھی کہ تمہیں یہاں سے کہیں اور بھیج دوں بس......''

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور الماری سے اپنے کپڑے اور دوسری ضروری چیزیں نکال کر بیگ میں رکھنے لگیں۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ نکالا۔ یہ بیگ رابعہ نے اسے گفٹ دیا تھا۔ اور اماں سے زیور اور نقد رقم لے کر اس میں رکھی۔ افضل ماموں، ہاسٹل میں اسے جو پیسے بھجواتے تھے اس میں سے ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچ جاتے تھے اس نے کبھی فضول خرچی نہیں کی تھی۔ اور اب بھی کبھی کبھار ماموں، کچھ نہ کچھ جیب خرچ اسے اور اماں کو دے دیتے تھے۔ وہ دونوں ہی انکار کرتیں لیکن وہ زبردستی دے دیتے۔

''رکھ لو روٹی کپڑے کے علاوہ بھی سو ضروریات ہوتی ہیں۔'' ماموں کا جملہ ہوتا۔

لمحہ بھر کے لیے اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ افضل ماموں نے بہرحال ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ مامی کا موڈ کبھی، کبھی خراب بھی ہو جاتا اور وہ بہانے، بہانے سو

urdunovels.com

باتیں سنا جاتیں...... لیکن زیادہ تر ان کا رویہ نارمل ہی رہتا۔ گھر میں کام کے لیے ملازمہ موجود تھی۔ وہ ناشتے کے وقت آتی اور پھر رات کو جاتی تھی۔ علم دین چاچا کل وقتی ملازم تھے۔ کچن کا سارا کام ان کے ذمے تھا۔ سب ہی ان کے ہاتھوں کے پکے کھانے کے عادی تھے۔ اس کے علاوہ بازار سے سودا سلف لانا، گیٹ کھولنا، بند کرنا۔ پودوں کو پانی دینا سب ان کے ہی ذمے تھا۔ اس پر یا اماں پر کوئی کام کا بوجھ نہیں تھا۔ فرسٹ فلور کے تین بیڈ رومز میں سے ایک بیڈ روم انہیں دے دیا گیا تھا۔ باقی دو بیڈ روم فواد اور فرہاد کے تھے دونوں بھائی جوان ماں بیٹی کے یہاں آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد باہر چلے گئے تھے۔ فرہاد شارجہ میں اور فواد کینیڈا میں سیٹل تھا۔ گراؤنڈ فلور پر ماموں، مامی اور جواد کے بیڈ روم تھے۔ اوپر چھت پر ایک کمرا اٹیچڈ واش روم کے ساتھ تھا۔ جو علم دین کے پاس تھا۔ اگرچہ افضل ماموں اور مامی ان سے اتنی محبت نہیں کرتے ہوں گے لیکن انہوں نے ان کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔

"اماں ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں کہ اگر ماموں نے ہاتھ جوڑ دیے تو وہ قربان ہو جاتی۔ کچھ بھی نہ کہہ سکتی...... اور جواد جیسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنا......"

اس نے ایک جھرجھری سی لی۔

"اماں آپ وضو کرلیں...... اور تیار ہو جائیں۔ جیسے ہی اذان ہوگی ہم نماز پڑھ کر نکل جائیں گے۔"

پھر وہ بیڈ سائڈ ٹیبل کے دراز سے بال پین اور ایک نوٹ بک نکال کر ماموں کو خط لکھنے لگی۔ صفحہ پھاڑ کر اس نے تہ کیا اور دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اسے علم دین سے بات کرنی تھی۔ سیڑھیاں دبے قدموں طے کر کے وہ اوپر پہنچی تو علم دین کے کمرے کے نیم وا دروازے سے روشنی کی ہلکی سی لکیر باہر آرہی تھی۔ شاید وہ جاگ رہے تھے۔ کیا خبر تہجد کے لیے اٹھتے ہوں......" اس نے سوچتے ہوئے دستک دی تو علم دین گھبرا کر دروازے پر آیا۔

"آپ......" وہ حیران ہوا۔

"ہاں چاچا آپ جب نماز کے لیے مسجد جائیں تو ہمیں بھی لے جائیے گا۔"

اس نے جواب دیا تو وہ کچھ پریشان ہو گئے۔

"لیکن آنے جانے میں دو تین گھنٹے لگ جائیں گے اور بڑے صاحب کو تو ٹھیک نو بجے بیڈ ٹی دینی ہوتی ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں چاچا بس ہمیں بس اسٹاپ تک چھوڑ کے آنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگیں گے۔ ہم خود ہی چلے جاتے لیکن بیگ بھی ہیں تو......" اس نے تسلی دی تو ان کے چہرے پر بھی اطمینان نظر آنے لگا۔

"لیکن آپ جائیں گی کہاں......؟"

"اپنے ایک عزیز کے ہاں جانا ہے اور یہ خط ماموں کو دے دیجیے گا جب وہ اٹھیں تو......" اس نے انہیں خط دیا جسے انہوں نے کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔

"پہلی اذان کے ساتھ ہی آجایئے گا۔" وہ انہیں تاکید کر کے جس طرح دبے پاؤں اوپر آئی تھی اسی طرح دبے پاؤں چلتی ہوئی واپس آگئی۔ اماں وضو کر کے جا نماز پر بیٹھی تھیں۔ شاید نفل پڑھ رہی تھیں۔ وہ واش روم میں چلی گئی اور وضو کر کے باہر آئی ہی تھی کہ دور کسی مسجد میں اذان کی آواز سنائی دی۔ اذان ختم ہوتے ہی وہ نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ نماز پڑھ کر اس نے چادر اور اسکارف لیا۔ تب ہی علم دین آگیا۔ اس نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بہت آہستگی اور خاموشی سے اس نے بیگ باہر رکھے۔

"چاچا، آپ یہ بیگ لے کر جائیں، ہم آرہے ہیں۔" علم دین نے سر ہلا کر بیگ اٹھا لیے اور محتاط قدموں سے چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے شولڈر بیگ دائیں کندھے پر لٹکایا اور اماں کی طرف دیکھا جو بے حد مضطرب سی کھڑی تھیں اور آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے بنا کچھ کہے ان کا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ علم دین گیٹ کے باہر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ بس اسٹاپ زیادہ دور نہیں تھا یوں بھی اس وقت یہاں سے کوئی سواری... رکشا، تانگا ملنا مشکل تھا۔ سو وہ پیدل ہی بس اسٹاپ پر پہنچے تھے۔ علم دین انہیں ایک بینچ پر بٹھا کر میر پور جانے والی بس کا پتا کرنے چلا گیا۔ اور فوراً ہی واپس آگیا۔

"بس تو تیار ہے بی بی...... آدھے گھنٹے تک چلے گی۔ آیئے آپ کو بس میں ہی بٹھا دوں......" اس نے بیگ اٹھا لیے تھے۔

"ٹھیک ہے چاچا، آپ ہمیں بٹھا کر چلے جائیں، آج ہماری وجہ سے آپ جماعت میں شامل نہیں ہوسکیں

کہ آپ کے واپس جانے تک نماز ہو چکی ہو گی۔ اس کے لیے معاف کر دیجیے گا۔‘‘

’’کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹیا.....‘‘ وہ شرمندہ ہوئے تھے۔

’’کئی دفعہ ہو جاتا ہے کہ با جماعت نماز نہیں پڑھ پاتا۔ اللہ آپ کو حفاظت سے لے جائے اور ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ صاحب تو بہت خیال کرتے تھے آپ کا لیکن کبھی، کبھی اولاد کی محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔‘‘ ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور وہ رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے چلے گئے تو اس کا دل بھی گداز ہونے لگا۔ سات سال پہلے بابا کے انتقال کے بعد وہ افضل ماموں کے گھر آ گئی تھی۔ اور اچانک یوں خاموشی سے گھر چھوڑ دینا۔ بہت تکلیف دہ تھا۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر اماں کی طرف دیکھا ان کی پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اور ایک گہری سانس لے کر شولڈر بیگ سے اپنا فون نکالنے لگی..... یہ فون ماموں نے اسے تب لے کر دیا تھا جب وہ قائد اعظم یونیورسٹی میں پڑھنے گئی تھی۔

’’کاش.....‘‘ اس کے لبوں سے ایک آہ نکلی اور وہ رابعہ کا نمبر ملانے لگی۔

☆☆☆

ناشتا کرتے ہوئے تیمور ملک، کرن سے ہلکی پھلکی باتیں کر رہے تھے۔

’’پتا ہے بابا، مجھے کل میری کلر بک پر ٹیچر نے تین اسٹارز دیے تھے۔ مجھے ہر روز ہوم ورک پر اسٹار ملتا ہے۔‘‘ اس نے فخر سے گردن تھوڑی سی اکڑائی۔

’’ہماری گڑیا ہے ہی بہت لائق اور ذہین۔‘‘ انہوں نے کرن کی پلیٹ میں فرنچ ٹوسٹ کا پیس رکھا۔

’’پتا ہے نان..... آپ کو رفیق بھائی نے یہ آپ کی فرمائش پر بنائے ہیں اور آپ نے یہ ذرا سا کھایا ہے۔ ایک سلائس تو ختم کریں۔‘‘

’’او کے بابا لیکن بس یہ ایک سلائس.....‘‘ اس نے سلائس اٹھالیا۔

’’پتا ہے بابا میری ٹیچر کہہ رہی تھیں کہ آپ کے مما اور بابا پیرنٹس میٹنگ پر کیوں نہیں آئے انہیں آپ سے بات کرنی تھی اور آپ کو پتا ہے بابا سب کے مما، ڈیڈی آئے تھے۔ میری فرینڈ نے بتایا تھا۔ پھر ٹیچر کو میں نے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جنوری 2024ء
کی جھلکیاں

شاعر انسانیت
پشتو ادب سے ایک نامور شاعر کی
حیرت انگیز داستانِ زیست

کرکٹ کا مغل اعظم
ایک معروف کھلاڑی کا
زندگی نامہ۔ جو آپ کو چونکا دے گا

کاروانِ زیست
آپ کے پسندیدہ قلم کار کی
زندگی سے ان کہی اور مختلف واقعات

اسیرِ جنوں
گلگت... داستان سے لہو کی رفتار
تیز کر دینے والی طویل سرگزشت

سمندروں پار اک جزیرہ
دل کے تار بج اٹھیں ایک
ایسا سفرنامہ

اس کے علاوہ
بہت سی دلچسپ داستانیں، سچے قصے،
سچ بیانیاں، اگر آپ ادب پرست ہیں
تو اس شمارے کو بھلا نہیں پائیں گے

بتایا کہ میری مما نہیں ہیں، وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں اور بابا بڑے دادا سے ملنے چلے گئے تھے۔''

''سوری بیٹا، بڑے دادا کی طبیعت خراب تھی ناں اور انہوں نے مجھے بلایا تھا۔''

تیمور ملک نے دودھ کا گلاس اس کے سامنے رکھا۔

''پتا ہے بابا میری ٹیچر کہتی ہیں کہ بچوں کے ماما، پاپا کو پی ٹی ایم میں ضرور آنا چاہیے اس طرح انہیں بچوں کی کارکردگی کا پتا چلتا رہتا ہے۔'' اس کی عادت تھی کہ کوئی بھی بات شروع کرنے سے پہلے ''پتا ہے'' لگاتی تھی۔

''تو بابا بچوں کے ماما، بابا کو میٹنگ میں آنا چاہیے ناں۔''

''بالکل آنا چاہیے میری جان...... promise (پرامس) اگلی میٹنگ میں کرن کے بابا ضرور آئیں گے۔ اب آپ جلدی سے یہ دودھ کا گلاس ختم کریں۔'' انہوں نے جگ سے دودھ گلاس میں ڈال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''آپ کو پتا ہے بابا مجھے دودھ اچھا نہیں لگتا......'' اس نے ناک چڑھائی۔

''ہاں لیکن کچھ چیزیں صحت کے لیے استعمال کرنا ضروری ہوتی ہیں ناں...... اور دودھ سے بچوں کی ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں۔ تو جو چیز ضروری ہو اچھا نہ لگنے کے باوجود بھی وہ کرنی چاہیے۔''

''اوکے بابا......'' اس نے دودھ کا گلاس اٹھالیا۔

کرن سے چھوٹی، چھوٹی باتیں کرتے ہوئے انہیں خیال ہی نہیں رہا کہ انیکسی میں ایک بن بلائی مہمان بھی ہے۔

''رضوانہ......'' انہوں نے ملازمہ لڑکی کو آواز دی...... رضوانہ کا کام کرن کا خیال رکھنا اور اس کے کام کرنا تھا۔ وہ مہراں کی بھانجی تھی اور دو ماہ پہلے ہی وہ اسے گاؤں سے لائی تھی۔

''کرن کو اسکول کے لیے تیار کرو...... اس کا بیگ اور یونیفارم تیار ہے۔''

''جی صاحب......'' رضوانہ نے کچن سے نکل کر جواب دیا۔

''رفیق بھائی لنچ باکس تیار کررہے ہیں۔''

''میں خود تیار ہوسکتی ہوں بابا...... آپ کو پتا ہے اب میں چھ سال کی ہوں......'' اس نے گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا۔

''بالکل پتا ہے میری جان...... رضوانہ باجی تو بس تھوڑی سی ہیلپ کروائیں گی آپ کو تیار ہونے میں۔''

''اوکے بابا......'' وہ زیادہ بحث نہیں کرتی تھی فوراً بات مان جاتی تھی...... رضوانہ اسے لے کر چلی گئی تو اپنے لیے چائے بناتے ہوئے یک دم ان کی نظر مہراں پر پڑی جو ابھی، ابھی باہر سے آئی تھی۔ اور اب کچن کی طرف جارہی تھی۔ اور مہراں کو دیکھتے ہی انہیں اس لڑکی کا خیال آگیا جو اب انیکسی میں تھی۔

''مہراں......'' انہوں نے اسے آواز دی۔

''تمہاری مہمان ٹھیک ہے؟''

''جی صاحب رات سکون سے گہری نیند سوتی رہی ہے۔ کچھ دیر پہلے ہی اٹھی ہے اور جب سے اٹھی ہے رو رہی ہے۔ میں اس کے لیے چائے لینے آئی تھی۔ بیچاری کے سر میں بہت درد ہے۔'' مہراں نے بتایا تو وہ پریشان ہوگئے۔

''تم اسے یوں ہی چھوڑ کر آگئی ہو......''

''نہیں صاحب، باہر سے دروازہ بند کر کے آئی ہوں......'' مہراں حویلی میں رہ کر آئی تھی اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ان بڑے زمینداروں کے معاملات سمجھتی تھی۔ گو یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ مصیبت کی ماری لڑکی اتفاق سے تیمور ملک کو ٹکرا گئی تھی اور وہ اس کی وجہ سے مشکل میں تھے۔

''ٹھیک ہے اسے اچھا سا ناشتا کرواؤ، جانے کب کی بھوکی ہے۔ میں کرن کو اسکول چھوڑ کر آتا ہوں تو پھر دیکھتا ہوں کیا کرنا ہے۔''

وہ مطمئن سے ہوکر اپنے لیے چائے بنانے لگے۔ ان کے چائے پینے تک کرن بھی تیار ہو کر آگئی تھی۔ رضوانہ کے ہاتھ سے اس کا اسکول بیگ اور پانی کی بوتل پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں کرن کا ہاتھ لیا۔ مہراں کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے محتاط رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کرن کا ہاتھ تھامے لاؤنج میں سے ہوتے ہوئے پورچ میں آئے۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اس کا بیگ اور پانی کی بوتل پچھلی سیٹ پر رکھی۔ وہ کرن کے معاملے میں کسی پر بھروسا نہیں کرتے تھے۔ خود ہی اسے اسکول چھوڑنے اور لینے جاتے تھے۔ دو سال پہلے وہ یہاں آئے تھے اور یہاں کے حالات سن، سن کر ان کا

دل ہولتا رہتا تھا کہ قریبی رشتے بھی بے اعتبار ہو گئے تھے سو کرن کی ذمے داری انہوں نے خود ہی اٹھا رکھی تھی ......اگرچہ ڈرائیور بھی دوسرے ملازمین کی طرح دادا جان نے گاؤں سے بھجوایا تھا۔ لیکن اپنی محتاط پسند طبیعت کی وجہ سے اگر وہ کسی وجہ سے مصروف ہوتے تو بچی کو بھی چھٹی کروا لیتے۔ کرن گھر سے اسکول تک مسلسل بولتی رہی اور نانو کے گھر کی باتیں بتاتی رہی کہ اسے وہاں کتنا مزہ آیا۔ لیکن جب بچے اسکول چلے جاتے تھے تو وہ بور ہو جاتی تھی کہ نانو اور آنٹی بقول اس کے کچھ بور سی تھیں لیکن پھر سبین آنٹی آ گئیں اور ان کے ساتھ اس نے خوب انجوائے کیا۔ اب اس کے پاس سبین آنٹی کے سوا اور کوئی موضوع نہیں تھا۔

''سبین آنٹی یہ اور سبین آنٹی وہ......''

وہ بدمزہ ہوئے لیکن انہوں نے اسے ٹوکا نہیں......وہ اس کی دل آزاری نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ سبین کو پسند کرتی ہے اور سبین بھی اس کے لاڈ اٹھاتی ہے۔ چاہے وہ مہینوں بڑی پھپو کے گھر نہ جائے لیکن جب اسے کرن کے آنے کا پتا چلتا تھا وہ فوراً ان کے ہاں آ جاتی تھی۔ سبین ان کی چھوٹی پھپو کی بیٹی تھی جبکہ کرن کی نانو ان کی بڑی پھپو تھیں اور وہ سب سمجھتے تھے کہ کرن کے لیے سبین کے اس التفات کا کیا مطلب ہے۔ دادا جان نے بھی تین روزہ قیام کے دوران نہ جانے کتنی بار کہا تھا کہ ''کرن کے لیے سبین سے بہتر کوئی ماں نہیں ہو سکتی۔ وہ بہت پیار کرتی ہے کرن سے......'' آخر دادا جان تک سبین کے کرن سے پیار کی کہانی کیسے پہنچی......تو یہ سب دراصل دادا جان اور پھپو کی پلاننگ تھی کہ سبین کرن کو خود سے اتنا مانوس کر لے کہ وہ سبین سے شادی کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں حالانکہ سبین کو کبھی بچوں سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ سبین نے کبھی اپنے سگے بھانجے بھانجیوں اور بھائی کے بچوں کو لفٹ نہیں کروائی تھی تو کرن کی بیٹی سے اتنا پیار اور محبت کیوں......؟

''پتا ہے بابا، سبین آنٹی نے مجھے کہانیاں سنائیں۔ پارک میں لے کر گئیں، غبارے اور کلر بک دی۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس کا سبین نامہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

''پتا ہے بابا......میں نے ان سے پوچھا کہ وہ ہمارے گھر کیوں نہیں آتیں تو انہوں نے کہا جب تمہارے بابا بلائیں گے تو تب آؤں گی......بابا آپ ان کو بلائیں ناں......ان سے کہیں وہ ہمارے گھر آئیں......''

''او کے، تمہارا اسکول آ گیا ہے۔'' انہوں نے سر ہلایا اور گاڑی پارک کرنے لگے۔ اور گاڑی پارک کر کے وہ گاڑی سے اترے اور کرن کی طرف کا دروازہ کھولا۔

''بابا......'' اترتے، اترتے اسے یاد آیا تھا۔

''پتا ہے میں نے سبین آنٹی سے کہا کہ وہ ہمارے گھر آ کر رہیں۔ میرے پاس، تب میں ہر روز ان سے کہانیاں سنا کروں گی ...... میرا جی چاہتا ہے وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ ہمارے گھر اور ہم خوب مزے کریں تو انہوں نے کہا کہ میں یہ آپ کو بتاؤں یاد سے......اور میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ کرن کوئی بات نہیں بھولتی بابا......'' بنا کچھ کہے انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ ان کا ہاتھ چھڑا کر اسکول کے گیٹ کی طرف بھاگی۔ انہوں نے اس کا بیگ چوکیدار کے حوالے کیا۔ جھک کر اسے پیار کیا اور خدا حافظ کہہ کر واپس مڑے۔ کرن کی باتوں نے انہیں الجھا دیا تھا۔

یعنی اب سبین اور ان کے حوالے سے ایک باقاعدہ مہم کا آغاز ہو گیا تھا۔ بہتر ہے کہ اب کرن کو وہ کم سے کم نانو کی طرف بھیجیں۔ چھوٹی پھپو اور بڑی پھپو کے گھر ساتھ، ساتھ ہی تھے۔ اس بار وہ حویلی دادا جان کی بیماری کی اطلاع پر گئے تھے لیکن دادا جان اتنے بیمار نہیں تھے جتنا ظاہر کر رہے تھے۔ انہیں بلانے کا اصل مقصد انہیں شادی کے لیے رضامند کرنا تھا۔ اور وہ فی الحال شادی کے لیے تیار نہیں تھے اور اپنے ابی جان کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھانا چاہتے تھے۔ آخری لمحوں میں بھی ان کی ملتجی نظریں ان کی طرف اٹھی تھیں۔

''میرے وعدے کا بھرم رکھو گے ناں......روزِ محشر مجھے میرے بھائی کے سامنے شرمندہ نہ ہونے دینا۔''

''میں اپنی آخری حد تک کوشش کروں گا...... مجھ سے جو بھی ہو سکا کروں گا......لیکن اگر کامیاب نہ ہو سکا تو مجھے معاف کر دیجیے گا ابی جان......''

''مجھے تم پر یقین ہے تیمور اور مجھے یہ بھی یقین ہے

کہ تم کامیاب رہو گے اور یہ یقین مجھے اس خواب نے دیا ہے جو کل رات میں نے دیکھا تھا...... اور ایک مرتے ہوئے آدمی کا خواب کچھ نہ کچھ تو سچا ہوگا ناں......"

پتا نہیں کیوں وہ پُر یقین تھے لیکن گزرے دو سالوں میں کئی بار وہ مایوس ہوئے تھے لیکن ہر بار ابی جان کی وہ آخری ملتجی نظریں انہیں اس مایوسی سے باہر لے آتی تھیں اور وہ پھر سے ایک نئے عزم سے کوشش شروع کر دیتے۔

"آخر سبین میں کیا برائی ہے تیمور......؟" دادا جان اس بار ہر صورت انہیں قائل کرنا چاہتے تھے۔

"خوب صورت ہے ایجوکیٹڈ ہے...... خاندانی ہے اپنا خون ہے۔"

"جی دادا جان یقیناً یہ ساری خوبیاں ہیں اس میں...... اور وہ شخص خوش نصیب ہوگا جس کی زندگی میں وہ شامل ہوگی۔ لیکن مجھے شادی نہیں کرنی ابھی......" نگاہیں جھکائے، جھکائے انہوں نے دادا جان سے کہا تھا۔

"کیوں شادی نہیں کرنی تم نے ...... جب سے تم پاکستان آئے ہو یہی کہہ رہے ہو، دیکھو اگر تم سبین سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو نہیں اور کسی سے...... کسی اچھے خاندان کی لڑکی سے کرلو...... کئی ایسے اعلیٰ خاندان میرے جاننے اور ملنے والے ہیں جو ہمارے خاندان میں رشتہ دے کر فخر محسوس کریں گے۔" دادا جان بولے۔

"سبین کے ساتھ تمہاری شادی کی ایک وجہ کرن بھی ہے، وہ اس کی خالہ زاد بہن کی بیٹی ہے جس طرح وہ اس کا خیال رکھ سکتی ہے باہر سے آنے والی کوئی دوسری لڑکی نہیں رکھ سکتی پھر بھی اگر تم سبین سے نہیں چاہتے تو راؤ اشتیاق احمد کی پوتی کے لیے بات چلائیں۔" دادا جان کا انداز سمجھانے والا تھا۔

"تمہاری چچی کی بھانجی ہے۔ اچھی پیاری لڑکی ہے تم ملنا چاہو تو مل بھی سکتے ہو......"

"دادا جان پلیز......" انہوں نے اپنی جھنجلاہٹ کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ "میں آپ کو بتا چکا ہوں کئی بار کہ مجھے شادی ہی نہیں کرنی سبین سے نہ کسی اور سے......"

"جانتا ہوں کیوں شادی نہیں کرنا چاہتے تم......" دادا جان جواب تک بڑے تحمل سے اور نرمی سے بات کر رہے تھے یک دم غصے میں آ گئے تھے۔

"مجھے اچھی طرح علم ہے کہ تمہارے باپ نے کیا پٹی پڑھائی ہے تمہیں...... اسفند اور آمنہ کے حادثے کے بعد بات ہوئی تھی میری اس سے...... تمہاری اور سبین کی شادی کے متعلق...... دیکھو تیمور، شاہ میر اب اس دنیا میں نہیں...... اس کے بیوی، بچے کہاں ہیں، ہمیں ان کی خبر نہیں، تمہارا باپ تمہاری شادی اس کی جس بیٹی سے کرنا چاہتا تھا۔ کیا خبر اب تک اس کی شادی بھی ہو چکی ہو...... تمہارے چاچو کو اللہ نے اولاد ہی نہیں دی...... اور وہ حضرت کسی کی اولاد گود لے کر مطمئن بیٹھے ہیں۔ اسفند اب اس دنیا میں نہیں...... صرف تم ہو...... میری نسل کے امین...... تم شادی نہیں کرو گے تو تمہارے بعد میرا کوئی نام لیوا نہیں رہے گا۔"

"کرن ہے ناں...... آپ کی نام لیوا......"

"نسل بیٹوں سے چلتی ہے، بیٹیوں سے نہیں...... وہ تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔"

تیمور کو اس لمحے وہ بہت افسردہ سے لگے تھے۔

"لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میرے بیٹے ہی ہوں گے...... بیٹیاں بھی تو ہو سکتی ہیں......"

"وہ بعد کی بات ہے جو مقدر میں ہوا لیکن تم شادی تو کرو...... کیا خبر اللہ تمہیں نعمت سے نواز دے۔" وہ جیسے ملتجی ہوئے تھے۔

"شاہ میر تایا کا بھی تو بیٹا ہے ناں...... ابی جان نے بتایا تھا ایک بار، تو ان سے آپ کی نسل......"

"شاہ میر کا بیٹا میری نسل کا امین کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تمہارے باپ کا بھائی ہے لیکن میرا بیٹا نہیں ہے۔" بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا تھا اور وہ بات کر کے پشیمان سے ہو گئے تھے کہ آج تک جس کا علم کسی کو نہیں تھا جذباتیت میں ان کے لبوں سے نکل گیا تھا۔ لیکن نہیں جانتے تھے کہ ازمیر یہ بات جانتا تھا اور اس نے ہی تیمور ملک کو بتایا تھا۔

"وہ تمہاری دادی کی پہلی شادی سے تھا۔" انہوں نے وضاحت کی تھی۔

"تمہاری دادی شادی کے دو سال بعد ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ میری خالہ زاد تھیں۔ میرے ساتھ جب ان کی شادی ہوئی تو شاہ میر دو سال کا تھا اور میں نے ہمیشہ اسے اپنی اولاد کی طرح ہی سمجھا...... کبھی اپنے بچوں کو بھی

معلوم نہیں ہونے دیا کہ شاہ میر کا باپ کوئی اور تھا۔"

اور تیمور ملک کا دل چاہا تھا کہ کہیں کہ اولاد کی طرح سمجھا لیکن اولاد نہیں جانا...... اولاد کی تو بڑی، بڑی غلطیاں معاف کردی جاتی ہیں۔ وہ تو بس اپنی پسند کی شادی ہی تو کرنا چاہتے تھے۔

ابی جان نے انہیں سب کچھ بتایا تھا۔ وہ سب جو دادا جان نے شاہ میر تایا کے ساتھ کیا تھا لیکن وہ خاموش رہے تھے کہ کہیں ان کی بات کو گستاخی نہ سمجھ لیا جائے اور ان کی تربیت پر حرف آئے۔

"اب جب آؤ تو کوئی فیصلہ کر کے آنا میں "نہ" نہیں سنوں گا...... اور اگر تم پھر بھی اپنی بات پر قائم رہے تو میں سمجھ لوں گا کہ تمہارا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں...... شاید میرے نصیب میں بے نام ہی مرنا لکھا ہے۔ چھ ماہ دیتا ہوں تمہیں...... ان چھ ماہ میں اگر تم اسے تلاش کرسکو جس کا عہد تم سے تمہارے باپ نے لیا ہے تو ٹھیک ہے، مجھے اس کے ساتھ تمہاری شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا...... اور اگر نہ کرسکو تو تمہارے لیے سین بہترین چوائس ہے۔ تمہیں میری بات ماننی ہوگی ورنہ دوسری صورت کی وضاحت کردی ہے میں نے۔" دادا جان حتمی انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ دادا جان جب کوئی فیصلہ کرلیتے ہیں تو پھر اس سے ہٹتے نہیں بھلے کچھ ہو جائے تو اگر انہوں نے کہہ دیا ہے تو پھر ساری زندگی وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ وہ پریشان سے واپس آرہے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ ڈاکٹر داؤد سے مشورہ کریں گے کہ شاہ میر تایا کی فیملی کی تلاش کے لیے...... وہ کیا کریں...... کیا یہاں پاکستان میں کوئی پرائیویٹ سراغ رساں مل سکتا ہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ایک بار پھر اخبار میں اشتہار دیں۔ شاید اب تائی جان کی نظر سے گزرے اور وہ مجھ سے رابطہ کریں۔ اور راستے میں یہ ایک مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ اب پتا نہیں کب تک اس مسئلے سے جان چھوٹے گی...... انہوں نے ساتھ والی سیٹ پر رکھا اپنا فون اٹھا کر ڈاکٹر داؤد کا نمبر ملایا۔

فون اٹھاتے ہی ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی ان کی آواز سنائی دی۔

"سمیرا کو تمہارے گھر ڈراپ کردیا ہے اور بچوں کو اسکول چھوڑنے جارہا ہوں کہ ڈرائیور آج صبح چھٹی لے کر چلا گیا ہے۔ واپسی پر تمہاری طرف ہی آؤں گا......" اور انہوں نے اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے فون آف کر دیا۔ ڈاکٹر داؤد انہیں بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح ٹریٹ کرتے تھے۔ اور انہیں بھی وہ اسفند کی طرح ہی لگتے تھے۔ مہربان اور شفیق...... ان دو سالوں میں انہوں نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ورنہ دو سال پہلے جب وہ پاکستان آئے تھے تو ابی جان اور اسفند بھائی کے بغیر خود کو بالکل اکیلا اور تنہا محسوس کرتے تھے۔ وہ حویلی میں تو صرف چند ہفتے رہے تھے پھر یہاں اپنے گھر آگئے تھے۔ اور ڈاکٹر داؤد کے تعاون سے انہیں یہاں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی جاب بھی مل گئی تھی۔ ان کا تعلیمی ریکارڈ شاندار تھا پھر باہر کی ڈگری، جاب ملنے میں زیادہ مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

انہیں یہاں اپنے گوجرانوالہ والے گھر میں رہنا تھا۔ گوجرانوالہ میں دادا جان کی کافی زمین تھی۔ جہاں انہوں نے دونوں بھائیوں کے لیے خوب صورت گھر بنوائے تھے کہ ان کے ابی جان نے گوجرانوالہ میں ہی کوئی کارخانہ لگا رکھا تھا اور زیادہ تر وہاں ہی رہتے تھے جبکہ تنویر چاچو کا زیادہ وقت گاؤں میں ہی گزرتا تھا۔ انہوں نے زرعی یونیورسٹی سے ڈگری لی تھی اور اب اپنی زمینوں کا کام دیکھتے تھے۔ اتفاق سے دونوں پھپھیوں کی شادی بھی گوجرانوالہ ہی میں ہوئی تھی...... اور دادا جان نے انہیں بھی جہیز میں گوجرانوالہ میں ہی ایک، ایک گھر دیا تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ میں ہی حاصل کی تھی...... اور ابھی او لیول کیا ہی تھا کہ ابی جان کارخانہ فروخت کر کے امریکا سیٹل ہوگئے تھے۔ گھر کی دیکھ بھال کے لیے ملازم تھے۔ اسفند چونکہ میڈیکل کالج میں تھے اس لیے وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی ہائیر اسٹڈی کے لیے امریکا آئے تھے۔ البتہ وہ لوگ سال دو سال بعد ہی دو، تین ہفتوں کے لیے پاکستان آتے تھے اور یہ دو تین ہفتے زیادہ تر گاؤں دادا جان کی حویلی میں ہی گزرتے۔ یہاں بھی ایک دو چکر لگ جاتے تھے۔ لیکن مستقل رہائش گاؤں میں ہی ہوتی تھی۔ اسفند کی شادی بھی پاکستان میں ہی ہوئی تھی آمنہ بھابی ان کی بڑی پھپھو

کی بیٹی تھیں اور ان کا نکاح ابی جان کے امریکا سیٹل ہونے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ البتہ شادی اسفند کے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ہوئی تھی۔

ڈاکٹر داؤد نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ لاہور میں انہیں اس سے بہتر اور اچھے پیکج پر جاب مل سکتی ہے۔ وہاں بھی ٹرائی کر لیں لیکن ان کا ارادہ یہاں مستقل رہنے کا نہیں تھا وہ جس مقصد کے لیے آئے تھے وہ پورا ہو جانے کے بعد انہیں بہر حال واپس جانا تھا۔ اور جاب تو محض انہوں نے مصروف رہنے کے لیے کی تھی اور اب دادا جان نے جو چھ ماہ کا الٹی میٹم دے دیا تھا تو چھ ماہ کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ بھی ہوتے تو انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ واپس چلے جائیں گے۔ انہیں ثمین سے شادی نہیں کرنی تھی۔ وہ اس کے مزاج کی سختی سے خوفزدہ تھے۔ بچپن میں بہت بار انہوں نے اسے چھوٹے بہن، بھائی پر غصہ کرتے اور چھوٹی سی بات پر ہنگامہ کرتے دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں ان کے ذہن میں تھا کہ شادی کے بعد ثمین، کرن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گی...... ہو سکتا ہے یہ محض ان کا وہم ہو لیکن جو بھی تھا انہیں ثمین سے شادی نہیں کرنی تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دادا جان جو انہیں کسی اور سے شادی کرنے کا کہہ رہے ہیں تو یہ محض بہلاوا ہے۔ اگر وہ کسی اور کے لیے ہاں کہیں گے تو وہ فوراً یہ کہہ کر منع کریں گے کہ کسی غیر لڑکی کا کیا اعتبار کہ وہ کرن سے کیا سلوک کرے...... ثمین تو پھر اپنی ہے...... وہ ان کے خیالات سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ وہ اپنی نواسی پر کسی اور کو بھی ترجیح نہیں دے سکتے تھے۔

''تو یہ طے ہے کہ مجھے چھ ماہ بعد کرن کو لے کر واپس نیویارک چلے جانا ہے۔'' اپنے فیصلے پر کسی حد تک مطمئن ہوتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس اجنبی لڑکی کے متعلق سوچنے لگے تھے جو اس وقت ان کی انیکسی میں موجود تھی۔ ثمیرا بھابی سے انہیں امید تھی کہ وہ ضرور اس سے سچ اگلوا لیں گی اور اگر حقیقت میں وہ بے گھر ہوئی اس کا کوئی گھر نہیں ہوا تو...... وہ پریشان سے ہو گئے تھے اور گھر آ کر وہ لان میں ہی بیٹھ کر ڈاکٹر داؤد کا انتظار کرنے لگے۔ امید تھی کہ ڈاکٹر داؤد ضرور اس کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لیں گے ابھی انہیں گھر آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر داؤد کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔

وہ ڈاکٹر داؤد کو لے کر لان میں ہی آ گئے تھے۔ آج موسم خوشگوار تھا۔ ہلکی، ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

''ثمیرا نے کچھ بتایا کیا کہتی ہے وہ لڑکی......؟''

''نہیں، میں تو انیکسی کی طرف ابھی نہیں گیا۔ یہاں ہی آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ بھابی شاید انیکسی میں ہی ہیں۔''

اپنے ہی خیالات میں الجھے انہیں یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ مہراں کو ہی بلا کر ثمیرا بھابی کے متعلق پوچھ لیں۔

''یار تم ایک سیدھی سادی معصوم سی لڑکی سے اس طرح خوفزدہ ہو رہے ہو جیسے وہ کوئی جن، بھوت یا چڑیل ہو۔'' ڈاکٹر داؤد ہنسے...... تب ہی ثمیرا انیکسی سے نکل کر ادھر آتی ہوئی نظر آئی۔

''لو وہ ثمیرا بھی آ گئی ہے چلو اندر چل کر آرام سے بات کرتے ہیں اور پھر تگڑا سا ناشتا کرواؤ...... رات کو...... دوبارہ اسپتال گیا تو صبح چار بجے ہی واپس آیا۔ دو تین گھنٹے ہی نیند لی تھی کہ ثمیرا نے جگا دیا کہ آج ڈرائیور نے چھٹی پر جانا ہے لہٰذا بچوں کو چھوڑنے آپ کو جانا ہے۔ جلدی سے نہا لیا اور اب پیٹ دہائی دے رہا ہے۔''

''چلیں...... '' وہ اٹھ کھڑے ہوئے...... ثمیرا بھی لان میں ہی آ گئی تھیں۔ سلام دعا کے بعد وہ انہیں ساتھ لے کر گھر کے اندر آئے اور رفیق کو ناشتا تیار کرنے کا کہہ کر ان کے ساتھ لاؤنج میں ہی آ کر بیٹھ گئے اور پھر ثمیرا بھابی کی طرف دیکھا۔

''کیا اس نے کچھ بتایا کہ کون ہے۔ نہر میں چھلانگ کیوں لگائی......؟''

''ہاں بہت مشکل سے بتایا۔ پہلے تو یہ ہی کہتی رہی کہ مجھے کسی دار الامان میں چھوڑ آئیں۔ یا کسی ایسے ادارے میں جہاں لاوارث عورتیں رہتی ہیں۔ پھر میرے اصرار پر اتنا بتایا کہ باپ کی وفات کے بعد مالک مکان نے گھر سے نکال دیا تو وہ اپنی والدہ کے ساتھ کہیں جا رہی تھی تو کوچ کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ کافی لوگ مر گئے، کافی زخمی ہو گئے تھے۔ اسے کوئی اندرونی چوٹ لگی تھی یا صدمے کی وجہ سے دو دن بے ہوشی نیم بے ہوشی کی کیفیت میں رہی۔ تیسرے دن اسپتال والوں نے فارغ کر دیا اس نے

زخمیوں میں اپنی والدہ کو ڈھونڈا تو وہ نہیں ملیں۔ پھر وہاں ہی کسی نے بتایا کہ کچھ لاوارث لاشیں مردہ خانے میں ہیں۔ لیکن اس کی والدہ وہاں بھی نہیں تھیں۔ پتا چلا کہ کچھ ناقابلِ شناخت لاشوں کو جو رکھنے کے قابل نہیں تھیں دفنا دیا گیا ہے۔ وہ وہاں ہی کھڑی رو رہی تھی کہ ایک شخص نے جو کافی دیر سے اس کے آس پاس ہی نظر آ رہا تھا اسے کہا کہ کچھ زخمی دوسرے اسپتال میں ہیں۔ آپ وہاں چل کر دیکھ لیں اور وہ بغیر سوچے سمجھے اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ اسے کسی اسپتال میں لے جانے کے بجائے اپنے گھر لے گیا۔ جب اس نے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ تو اس نے کہا کہ بس دومنٹ کا کام ہے تم یہاں بیٹھو میں ابھی آ رہا ہوں، ایک کمرے میں بٹھا کر وہ باہر نکل گیا۔ کچھ دیر گزر گئی تو اس نے دروازہ کھول کر باہر جانا چاہا تو دروازہ باہر سے بند تھا...... وہاں سے وہ کیسے بھاگی اس نے تفصیل نہیں بتائی۔ بس صرف اتنا بتایا ہے کہ بھاگتے ہوئے نہر نظر آئی تو دل میں یہ خیال آیا کہ اماں بھی نہیں رہیں اب جی کر کیا کروں گی تو بغیر سوچے سمجھے چھلانگ لگا دی۔''

''اور آپ نے اس کی کہانی پر اعتبار کر لیا بھابی......؟'' خاموشی سے ان کی پوری بات سننے کے بعد تیمور علی نے پوچھا تو سمیرا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں، مجھے لگتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔''

''آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے؟'' تیمور کو یقین نہیں تھا کہ اس لڑکی نے سچ بتایا ہو۔ ''ضرور وہ گھر سے بھاگی ہوگی اور پھر رسوائی سے بچنے کے لیے نہر میں چھلانگ لگائی۔ صاف، صاف خودکشی کی کوشش۔''

''فرض کرو تیمور، وہ جھوٹ بول رہی ہے تو بھی اب کیا کرنا ہے۔ گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو گھر والے بھی قبول نہیں کرتے۔'' ڈاکٹر داؤد نے جو اس ساری گفتگو کے درمیان خاموش رہے تھے۔ تیمور علی سے پوچھا۔

''وہ کہہ رہی ہے کہ اس پر اتنی مہربانی کریں کہ کسی ادارے میں پہنچا دیں کہ اس کا اس دنیا میں ایک ماں کے سوا کوئی نہیں......'' تیمور علی کے بجائے سمیرا نے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے...... داؤد بھائی آپ کو علم ہوگا ایسے کسی ادارے کا تو پلیز مجھے بتائیں، میں اسے وہاں چھوڑ آتا ہوں بلکہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ بلکہ اس سے یہ بھی پوچھ لیں کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ جہاں جا رہی تھی وہاں ہی کیوں نہیں چلی جاتی۔'' تیمور نے فیصلہ کر لیا کہ جب وہ اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتی تو اسے کسی ادارے میں ہی چھوڑ دیا جائے۔

''اول تو میں کسی ایسے ادارے کے متعلق نہیں جانتا جو قابلِ اعتبار ہو، تم باہر سے آئے ہو، تم نہیں جانتے اخبارات میں ان اداروں کے متعلق چھپتا رہتا ہے کہ وہاں بھی پناہ لینے والی لڑکیوں اور عورتوں کی عزت محفوظ نہیں ہوتی۔ اچھے ادارے بھی ہوں گے لیکن پہلے کسی نہ کسی سے معلومات لینی ہوں گی۔ اور پھر یہ کوئی اتنا آسان نہیں ہوگا کہ ہم اس کا ہاتھ پکڑیں اور کسی ادارے میں جا کر چھوڑ آئیں۔ وہاں کی انتظامیہ بھی دس سوال کرے گی ہم سے۔'' ڈاکٹر داؤد چاہتے تھے کہ اس لڑکی کی زندگی اللہ نے بچائی ہے تو اس کے ساتھ اب کچھ برا نہ ہو۔

''تو......؟'' تیمور ملک جھنجلائے۔ ''پھر کیا کروں مہران سے کہتا ہوں اس سے کہہ دو جہاں جانا چاہتی ہے چلی جائے۔''

''دوبارہ خودکشی کرنے......؟'' اتنا کہہ کر ڈاکٹر داؤد کھڑے ہو گئے کہ رفیق نے آ کر ناشتا لگنے کی اطلاع دی تھی۔

''پہلے پیٹ پوجا پھر کچھ اور......''

اور ناشتے کے بعد وہ تیمور کے ساتھ انیکسی میں آئے کہ ایک بار وہ خود اس سے کچھ سوال کرنا چاہتے تھے۔ وہ بیڈ پر ہی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر داؤد نے دروازے کو انگلی سے بجایا تو اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اور کچھ دیر یونہی خالی، خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

آنکھیں شدتِ گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن گلاب کی پنکھڑیوں ایسے لب کپکپا کر رہ گئے تھے۔

وہ بلا کی حسین لڑکی تھی۔ ڈاکٹر داؤد نے نظریں جھکا لیں۔

''بی بی آپ کی کوچ کو یہ حادثہ کب پیش آیا تھا اور کہاں؟''

''ہم سیالکوٹ سے پندرہ تاریخ کو کوچ میں سوار ہوئے تھے۔ مجھے تحصیل ڈسکہ کے ایک گاؤں کے اسکول میں جاب ملی تھی۔ ہم وہاں ہی جا رہے تھے۔ حادثہ کہاں پیش آیا مجھے نہیں پتا لیکن ہم نے تقریباً گھنٹے بھر کا سفر طے

کرلیا تھا۔" وہ ڈاکٹر داؤد کے اس سوال پر حیران ہوئی تھی۔

"میری مسز نے بتایا ہے کہ آپ کسی ادارے میں جانا چاہتی ہیں۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں تو آپ کو اتنا تو اندازہ ہوگا کہ اس طرح کا ہر ادارہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ میں کسی اچھے ادارے کے متعلق پتا کرواتا ہوں لیکن جب تک مجھے پتا نہیں چلتا آپ یہاں ہی رہیں۔ اور اطمینان رکھیں یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ محفوظ ہیں۔"

تیمور علی نے جو بیزار سے کھڑے تھے ڈاکٹر داؤد کی بات سن کر چونک کر انہیں دیکھا۔ پیشانی پر ناگواری سے شکنیں سی پڑیں۔ اور لہجے میں تلخی در آئی۔

"ان کا کوئی عزیز، رشتے دار تو ہوگا۔ کسی ادارے میں جانے کے بجائے یہ ان کے ہاں بھی تو جا سکتی ہیں۔ لیکن شاید یہ اپنے رشتے داروں کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں ہیں۔"

"نہیں ہے میرا کوئی عزیز رشتے دار......" بہت دیر سے روکے ہوئے آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

"میں آپ کی شکر گزار ہوں آپ نے میری زندگی بچا کر مجھ پر دُہرا احسان کیا۔ مجھے حرام موت سے بچایا۔ میں ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔ احسان مند رہوں گی۔ لیکن خدا کے لیے مجھے اپنے لفظوں کے تیروں سے اس طرح گھائل مت کریں کہ میں ایک بار پھر موت کی خواہش کرنے لگوں......" اس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا...... اور کہا تھا۔ ان آنکھوں میں دکھ، اذیت، بے بسی، پتا نہیں کیا تھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکلے۔ جیسے ان آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہ ہو۔ وہ ایسے نہیں تھے یہ سب غصہ ناگواری، تلخی دادا جان سے اس تین روزہ ملاقات کا نتیجہ تھی۔

"میں نے آپ کی مسز کو جو اور جتنا بتایا ہے ڈاکٹر صاحب اس میں کچھ بھی جھوٹ نہیں ہے۔" انہوں نے باہر نکلتے، نکلتے سنا وہ کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر داؤد اسے تسلی دے کر ان کے پیچھے ہی باہر نکلے۔

"تم بھی حد کرتے ہو تیمور...... وہ یقیناً ایک مظلوم لڑکی ہے۔"

"آپ کو کیا پتا وہ کیسی لڑکی ہے۔" انہوں نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

"اور یہ آپ نے کیا کہا کہ وہ کچھ دن یہاں رہے۔ میں بھلا کیسے اسے یہاں رکھ سکتا ہوں۔ نہیں داؤد بھائی نہیں......"

"اور میں اس لڑکی کو دنیا کے جنگل میں تباہ و برباد ہونے کے لیے نہیں دھکیل سکتا۔ اللہ نے یہ ذمے داری تم پر ڈالی ہے تو تم اسے احسن طریقے سے نبھاؤ...... چند دن کی تو بات ہے جیسے ہی میں کسی ادارے سے مطمئن ہوتا ہوں اسے وہاں پہنچا دیں گے یا پھر کسی اچھی شریف فیملی کا پتا کرتا ہوں جنہیں گھر میں کسی کیئر ٹیکر خاتون کی ضرورت ہو...... مسز انصاری اس طرح کی لڑکیوں کی مدد کرتی رہتی ہیں، سمیرا سے کہوں گا وہ کراچی سے آجائیں تو ان سے بھی بات کرلیں۔"

مسز انصاری ان کی فیملی فرینڈ تھیں اور کافی مخیر خاتون تھیں۔ یتیم، لاوارث اور خاوندوں کی ستائی ہوئی لڑکیوں کے لیے بہت کام کیا تھا انہوں نے۔ اب اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ کچھ عرصہ سے اتنی فعال نہیں رہی تھیں۔

"تو آپ لے جائیں ناں اسے ساتھ۔ اپنے گھر میں رکھ لیں پلیز......"

انہوں نے جیسے التجا کی تھی۔

"اول تو میرے گھر میں ایک ہی سرونٹ کوارٹر ہے، جہاں میرا ڈرائیور اور چوکیدار دونوں رہتے ہیں۔ اور گھر کے اندر ایک نامحرم لڑکی کیسے رہ سکتی ہے میرے بھائی...... تم اپنی سمیرا بھابی کو نہیں جانتے کس قدر شکی مزاج ہے، ایک تو یہ جوان لڑکی ہے اس پر ایسا غارت گر حسن...... تمہاری بھابی تو کبھی اسے گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں گی...... اور فرض کرو وہ اسے ہمدردی اور مروت میں رکھ بھی لے تو اس کا اور میرا جینا حرام کردے گی۔" باتیں کرتے، کرتے وہ پورچ تک آگئے تھے۔

"یہاں میرے گھر میں بڑی پھپو اور جواد بھائی وغیرہ کرن سے ملنے آتے رہتے ہیں...... ایک لڑکی کو یہاں دیکھ کر کیا کہیں گے اور پھر یہاں رفیق بھائی کے علاوہ سب ملازم دادا جان نے گاؤں سے بھجوائے ہیں۔ انہیں تو دو دن میں ہی خبر ہوجائے گی کہ میری انیکسی میں کوئی لڑکی موجود ہے۔ کیا، کیا باتیں نہیں بنیں گی۔ میرے

کردار پر انگلیاں اٹھیں گی۔" انہوں نے بے بسی سے ڈاکٹر داؤد کو دیکھا۔ "اور دادا جان کو تو مجھ پر پریشر ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔ میں تو آپ کو بتا بھی نہیں سکا اس مصیبت کی وجہ سے کہ اس بار دادا جان نے کیسے، کیسے اور کیا، کیا کہہ کر مجھ پر پریشر نہیں ڈالا۔"

"ریلیکس یار......" انہوں نے تسلی کے انداز میں ان کا بازو تھپتھپایا۔

"کہہ دینا رفیق کی رشتے دار ہے نوکری کی تلاش میں آئی ہے گاؤں سے۔ پڑھی لکھی ہے جاب مل جائے گی تو چلی جائے گی۔"

"اور کسی نے رفیق سے پوچھ لیا تو......؟"

"ارے گھامڑ رفیق تمہارا ملازم ہے، اسے سمجھا دینا میں اور سمیرا کوشش کرتے ہیں کہ جلد از جلد اس کے لیے کوئی بندوبست کر دیں۔ آپس کی بات ہے سمیرا میرے علاوہ سب کے لیے بہت نرم دل ہے۔ میری تو غلطی سے بھی کسی لڑکی پر نظر پڑ جائے اور میں اس کے حسن کی تعریف کر دوں بھلے ٹی وی کی اسکرین پر ہی میں کسی محترمہ کی طرف دھیان سے دیکھ لوں تو پھر بس میری خیر نہیں......اس کا بس نہیں چلتا کہ میری آنکھیں ہی پھوڑ دے یا کچا چبا جائے۔" انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے تیمور علی کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ تیمور علی کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"خیر بھابی اب ایسی بھی نہیں ہیں آپ خواہ مخواہ مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔"

"یہ تو وہی جانتا ہے جس پر بیتتی ہے۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"سمیرا کو بھیج دو یار، میں پہلے ہی کچھ لیٹ ہو گیا ہوں۔"

"داؤد بھائی کوشش کیجیے گا کہ جلدی میری اس مصیبت سے جان چھوٹ جائے۔" انہوں نے جیسے ہار مان لی تھی۔

"بے فکر رہو......نیکی کی ہے تو اسے اب ضائع مت کرو میری جان......"

"ایسی نیکی جو گلے پڑ جائے اللہ آئندہ مجھے اس سے بچائے۔" جھنجلا کر کہتے ہوئے وہ برآمدے کی

غزل

دل کا ارماں اپنے اندر ہی چھپا رہ جائے گا
کاتبِ تقدیر کا آخر لکھا رہ جائے گا

محفلوں میں دیکھ کے جو پھیرتا ہے اپنا رخ
وہ اکیلے میں مجھے ہی سوچتا رہ جائے گا

کہہ رہا تھا مجھ سے میرا دوست پیارا ایک دن
تو جو بچھڑا زندگی میں اک خلا رہ جائے گا

بن پڑا جب کچھ نہیں تو اس کو یہ کہنا پڑا
جس دیے میں جان ہو گی وہ دیا رہ جائے گا

میرے گھر کی ساری رونق پیاری ماں کے دم سے ہے
ماں جو بچھڑی کیا مرے گھر میں بچا رہ جائے گا

یہ شگفتہ کا ہے ایماں اک حقیقت ہے خدا
آندھیوں کے بعد بھی نامِ خدا رہ جائے گا

کلام: شگفتہ شفیق، کراچی

UrduNovels.com

سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

☆☆☆

"رابعہ تم نے کسی سے بات کی میری جاب کی؟"
اس نے رابعہ سے پوچھا جو بڑی دیر سے کرسی پر آگے پیچھے جھولتی ہوئی کوئی ڈائجسٹ پڑھنے میں مگن تھی۔

"ہاں کی ہے بات لیکن گورنمنٹ کی جابز تو ابھی اناؤنس نہیں ہوئی ہیں۔ دو تین پرائیویٹ اسکول ہیں ادھر وہاں تمہاری سی وی بھجوادی ہے لیکن تمہیں آخر مسئلہ کیا ہے۔ یہاں کوئی تکلیف ہے تمہیں......" رابعہ نے ڈائجسٹ بند کر کے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا۔

"نہیں رابی، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن آخر ہم کب تک یہاں تمہارے گھر بوجھ بن کر بیٹھے رہیں گے۔ پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے۔ پھر تمہاری اماں، ابا کیا سوچتے ہوں گے کہ یہ مہمان تو بلائے جان گئے ہیں۔" اس روز بس میں بیٹھ کر اس نے رابعہ کو اپنے آنے کا بتایا تو وہ بے حد خوش ہوئی تھی اور جب وہ میرپور پہنچے تو وہ اسٹاپ پر اپنے ابا کے ساتھ اسے لینے آئی ہوئی تھی۔ گھر آ کر اس نے سب کچھ رابعہ کو بتا دیا تھا۔

"بہت اچھا کیا تم نے تاشی جو یہاں آ گئی ہو...... اب مزے سے یہاں رہو...... میں بھی آپا کی شادی کے بعد اب گھر آئی ہوں تو بہت بور ہوتی ہوں......"

"لیکن میں ساری زندگی یہاں نہیں رہ سکتی رابو...... میں چاہتی ہوں کہ مجھے کہیں کسی اسکول وغیرہ میں جاب مل جائے تو یہاں ہی کہیں ہم ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیں۔ تم پلیز جاب ڈھونڈنے میں میری مدد کر دو...... ہمارے پاس کچھ زیور ہے تھوڑا سا ہی ہے۔ زیادہ تو بابا کی بیماری کے دوران بک گیا تھا۔ تب بھی اتنا ہے کہ ابتدائی اخراجات کے لیے کافی ہوگا۔ تم اپنے ابا سے کہہ کر فروخت کروا دینا۔"

"او کے، ڈھونڈ لیتے ہیں تمہارے لیے جاب بھی فی الحال تم یہاں بے فکر ہو کر رہو...... اور اس ابنارمل شخص سے بچ جانے کی خوشی مناؤ۔" وہ ایسی ہی تھی بے فکر اور لاابالی سی۔

اس نے اپنی تعلیمی اسناد کی نقل اسے دے دی تھی لیکن ابھی تک رابعہ نے اسے جاب کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔

"اول تو یہ تم بوجھ نہیں ہو بالکل بھی...... دوم میرے اماں، ابا کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ اماں کو اپنی کہانیاں اور قصے سنانے کے لیے ایک سہیلی مل گئی ہے۔ اور ابا کی اماں کی فضول بحث سے جان چھوٹ گئی ہے تو اپنے چھوٹے سے دماغ پر زور مت ڈالو تو اچھا ہے۔" اس نے پھر ڈائجسٹ اٹھا لیا۔

"رابی پلیز میں سنجیدہ ہوں، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو کہ ہم ساری زندگی یہاں تمہارے گھر نہیں رہ سکتے۔ تمہارے اماں، ابا کچھ نہ کہیں تمہارے عزیز رشتے دار ہیں وہ کیا کہیں گے۔ وہ ایک تیز، تیز بولنے والی خاتون ہماری موجودگی میں تین بار آ چکی ہیں اور کل تو بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔" اس نے ڈائجسٹ رابعہ کے ہاتھ سے لے کر اپنے پاس تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"رشتے داروں نے بھلا کیا کہنا ہے اور وہ خاتون ہماری پڑوسن ہیں اور تمہارے آنے سے پہلے بھی وہ ہر دوسرے تیسرے دن ہمارے گھر چکر لگاتی تھیں۔ اماں نے انہیں بتا دیا تھا کہ تم میری سہیلی ہو۔ اور کچھ دن میرے اصرار پر میرے پاس رہنے آئی ہو......"

اس نے تکیے کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ جب تک وہ ڈائجسٹ ختم نہ کر لیتی تھی اسے چین نہیں آتا تھا بقول اس کی اماں کے ڈائجسٹ پڑھنے کا نشہ تھا اسے۔

"اوں ہوں......" تاشہ نے تکیے کے اوپر ہاتھ رکھا۔

"پہلے میرا مسئلہ حل کرو یار...... یہ کچھ دن جو تم نے کہا ہے۔ یہ کب کے گزر چکے ہیں۔ سنو اگر کسی اسکول میں جاب نہیں مل سکتی تو کہیں اور ٹرائی کرتے ہیں۔ اور تم پلیز اپنے ابا سے کہو کہ کوئی کرائے کا گھر ڈھونڈ دیں۔ ایڈوانس وغیرہ کے لیے اماں کے پاس زیور ہے ناں وہ بیچ دیتے ہیں۔ اور جب تک کوئی جاب نہیں ملتی باقی ماندہ رقم سے گزارہ کر لیں گے۔ تمہارے گھر کب تک رہیں اب......"

"او کے یار سوچتی ہوں کچھ......"

رابعہ اس کی سوچ اور کیفیت سمجھ رہی تھی۔ لیکن جاب ملنا اتنا آسان کب تھا۔ پرائیویٹ اسکولز والے تو چند سو سیلری دے رہے تھے اور گورنمنٹ کی نوکریاں فی الحال نہیں آئی تھیں۔ اسے یا اس کے والدین کو ان کے اپنے ہاں

رہنے سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کھلے ہاتھ اور بڑے دل کے لوگ تھے لیکن نتاشہ کی خوددار طبیعت کو وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے اصرار کے باوجود زیادہ دن نہیں ٹھہرے گی۔

''اچھا تم ہمیشہ ہمارے گھر مت رہنا لیکن جب تک تمہیں اچھی جاب نہیں مل جاتی تب تک رہو ناں......''

''اور اچھی جاب کب تک ملے گی؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''پتا نہیں...... لیکن سچی بات ہے میں نے سنجیدگی سے ابھی تک تمہارے لیے جاب تلاش ہی نہیں کی۔ جہاں تمہاری سی وی بھجوائی تھی وہاں سے پھر پتا نہیں کیا کہ وہاں سیلری بہت کم ملتی تمہیں...... میں دراصل گورنمنٹ جاب کا انتظار کر رہی تھی...... لیکن تمہیں تو ہول اٹھنے لگے ہیں جیسے ہم تمہیں کھا جائیں گے۔'' اس نے ناراضی والی شکل بنالی۔ ہونٹ لٹکا کر نگاہیں جھکا کر......

''خیر اب ابا سے بھی بات کرتی ہوں محکمۂ تعلیم میں ان کی کافی جان پہچان ہے...... اور...... ہاں......'' اسے یک دم یاد کچھ آیا تھا۔

''وہ...... وہ یاد ہے ناں تمہیں رعنا کوثر...... ہمارے ساتھ والے روم میں تھی۔''

''ہاں...... وہ جسے سب، مطلب اس کی روم میٹ کوثری کہتی تھیں۔ اور تمہاری اس کے ساتھ کافی گپ شپ تھی۔ اور فارحہ کہتی تھی تم ہم سے زیادہ اس کی دوست بن چکی ہو......'' نتاشہ کو بھی وہ بے حد مخلص سے لڑکی یاد تھی جو سردیوں میں گاؤں سے ان کے لیے بھنی ہوئی مونگ پھلی اور آٹے کی میٹھی ٹکیاں اور خوب زیادہ میوے والی پنجیری لاتی تھی۔

''میرا اس سے رابطہ ہے...... پہلے تو خط کے ذریعے تھا لیکن چند ماہ پہلے ان کے گاؤں میں بھی ٹیلی فون کے کھمبے لگ گئے تو اس سے اب کبھی کبھار فون پر بھی بات ہو جاتی ہے۔ تمہارے آنے سے ایک دن پہلے ہی اس نے کہا تھا کہ وہاں اس کے گاؤں میں کوئی سائنس ٹیچر نہیں ہے۔ اس کی امی وہاں کے سرکاری اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہیں۔ دراصل سال دو سال پہلے ہی اسکول ہائی ہوا ہے وہ اپنی امی کے اسکول میں ہی ایڈہاک بیس پر پڑھا رہی ہے۔ جب جابز ہوں گی تو پھر اپلائی کرے گی۔

اگر تم کہو تو تمہارے لیے بات کروں اس سے...... جب سے اسکول ہائی ہوا ہے، کیمسٹری اور فزکس کی کوئی ٹیچر نہیں ہے وہاں...... لیکن تمہیں گاؤں میں رہنا پڑے گا...... سیالکوٹ سے کافی آگے ہے اس کا گاؤں......''

''تو کیا ہوا...... تم بات کروا بھی اس سے...... کہیں سے تو شروع کرنا ہے ناں مجھے...... اور جہاں تک سیالکوٹ کے گاؤں کی بات ہے تو یہ تو اچھا ہے یہاں... میرپور میں تو کبھی نہ کبھی ماموں کا سامنا ہو سکتا ہے آتے جاتے اتفاقاً...... پنجاب کے کسی گاؤں میں چلے جائیں تو پھر یہ امکان نہیں ہوگا کہ کسی روز سامنا ہو جائے گا۔'' اس نے اپنے خدشے کو زبان دی۔

''پتا ہے رابو میں اب زندگی بھر ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی میں ان سے نظریں نہیں ملا سکتی۔ انہوں نے اس وقت ہمارے سر پر ہاتھ رکھا جب ہمارا کوئی نہیں تھا۔ میں نے بہت سوچا...... یہاں آنے کے بعد بھی کئی بار کہ واپس لوٹ جاؤں اور...... لیکن رابی میں خود کو تیار نہیں کر سکی اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے...... بہت مشکل ہے۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے تاشی، تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ اپنے آپ پر ظلم کرنے والا بھی خود ظالموں میں شامل ہوتا ہے۔'' وہ اٹھی۔

''لاؤ اب یہ ڈائجسٹ مجھے دو...... اتنی مزے کی کہانی پڑھ رہی تھی۔''

''نہیں پہلے فون کروا اپنی کوثری کو......'' اس نے ڈائجسٹ تکیے کے نیچے سے نکال کر ہاتھ پیچھے کرلیا۔

''یہاں سے ڈائریکٹ فون نہیں ہو سکتا۔ کال بک کروانی پڑتی ہے۔ میں کال بک کرواتی ہوں...... عموماً آپریٹر بیس، پچیس منٹ میں کال ملا دیتا ہے۔''

وہ نتاشہ سے رسالہ لے کر باہر چلی گئی کہ ٹیلی فون سیٹ باہر برآمدے میں تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی بیڈ پر بیٹھی رہی۔ خالی الذہن سی پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ اماں باہر تخت پر رابعہ کی امی کے ساتھ بیٹھی تھیں جو اپنے نواسے کے لیے اونی ٹوپی بن رہی تھیں اور ساتھ، ساتھ اماں سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔

موضوعِ گفتگو رابعہ کی شادی تھی جو اس کے خالہ زاد

کے ساتھ طے تھی اور میر پور کے اکثر لوگوں کی طرح رابعہ کی خالہ کی فیملی بھی انگلینڈ کے شہر برمنگھم میں رہائش پزیر تھی اور اگلے سال تک ان کی آمد متوقع تھی۔

"میں نے تو کہا ہے کہ آپا سے رابی کی تعلیم مکمل ہو چکی۔ دو تین ماہ تک آ کر اپنی امانت لے جائیں زندگی کا کیا اعتبار، ماں، باپ کے جیتے جی بیٹیوں کے فرائض ادا ہو جائیں تو اچھا ہے۔" رابعہ کی امی کہہ رہی تھیں وہ خاموشی سے ایک طرف رکھے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

"ہاں بہن...... ماں، باپ کے بعد بیٹیاں تو رُل ہی جاتی ہیں...... بھائی ہوں... تب بھی......" اس نے دیکھا اماں آج عام دنوں سے زیادہ افسردہ لگ رہی تھیں۔ یوں ایک دم اچانک کسی دوسرے کے گھر آ کر بیٹھ جانا آسان نہ تھا۔

"ہاں، لیکن آپا کہتی ہیں کہ جہانگیر کو ابھی چھٹی نہیں مل سکتی۔ دسمبر میں کوشش کریں گی۔ ویسے ان کا ارادہ فروری میں تھا۔"

تب ہی فون کی بیل ہوئی اس نے رخ موڑ کر برآمدے کی اس سمت دیکھا جہاں ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس رابعہ کرسی بچھائے ڈائجسٹ کھولے بیٹھی تھی۔ شاید کال مل گئی تھی۔ رابعہ نے ریسیور اٹھالیا تھا۔ بات کر کے وہ ان کی طرف آ گئی۔

"بات ہو گئی ہے میری کوثر سے۔ بہت خوش ہوئی سن کر کہنے لگی اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ امی بھی بہت خوش ہوں گی بہت پریشان رہتی ہیں اپنی اسٹوڈنٹ کے لیے کبھی کسی کی منت کر رہی ہوتی ہیں کبھی کسی کی...... محکمۂ تعلیم کو خط لکھ، لکھ کر تھک گئی ہیں۔ ایک دو بار ٹیچر آئیں بھی لیکن یہاں نہیں ٹکیں۔ سفارش کروا کر تبادلہ کروالیا۔ لیکن سیلری ہاف ملے گی۔ شاید ویسے صحیح تو مجھے علم نہیں ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا رابی......" وہ مطمئن ہوئی تھی۔ "ہم گزارہ کر لیں گے۔ پھر وہاں گورنمنٹ کے اسکول میں ہوں گی تو جاب کا بھی پتا چلتا رہے گا۔"

"کوثر کہہ رہی تھی رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اسکول کے ساتھ ہی ان کے دو ذاتی مکان ہیں جو ان کی اماں ہمیشہ ہی دوسرے شہر سے آنے والی ٹیچرز کو رہائش کے لیے دے دیتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شہر میں رہنے والی دو تین ماہ میں ہی گھبرا جاتی ہیں، تم رہ لوگی ناں وہاں......؟"

"کیوں نہیں...... مجھے گاؤں پسند ہے، میرے بابا کا تعلق بھی گاؤں سے تھا، وہ اکثر اپنے گاؤں کے متعلق بتاتے رہتے تھے۔"

"لیکن شہری لوگوں کے لیے وہاں رہنا مشکل ہوتا ہے۔ سن کر پسند کرنا اور بات ہے...... اور جا کر رہنا اور بات......" رابعہ نے دوسرے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کب جانا ہوگا ہمیں......؟"

"وہ تو کہہ رہی تھی کہ کل ہی آجاؤ لیکن میں نے کہہ دیا کہ دو، تین دن تک آئے گی۔"

"کہاں، کہاں جا رہے ہیں ہم......" اماں نے جو خاموشی سے ان کی باتیں سن کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ یہ ساری بات چیت کس سلسلے میں ہے بے اختیار پوچھا۔

"ابھی آپ کو تفصیل بتاتی ہوں پہلے خود تو سب معلوم کرلوں......" اس نے اماں کو تسلی دی اور رابعہ کی طرف دیکھا۔

"دو، تین دن تک کیوں...... کل کیوں نہیں؟"

"کل تو ہم شاپنگ کریں گے کہ یہاں آزاد کشمیر کے اور وہاں کے موسم میں فرق ہے...... وہاں تو گرمیاں شروع ہو گئی ہیں اور پرسوں عابد ولت کی سالگرہ بھی تو ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے ڈائجسٹ کھولا۔

"یہ کیا پروگرام بن رہا ہے رابی......" اب کے رابعہ کی امی بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

"کچھ نہیں ان محترمہ کا خیال ہے کہ ہم پر بوجھ ہیں۔ لہٰذا انہیں کہیں جاب کر کے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ تو اس کی جاب کے متعلق ہی پروگرام بنا رہے ہیں۔" اس نے شاکی نظروں سے نتاشہ کی طرف دیکھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے اتنی دور جائے لیکن دو سال اکٹھے ایک ہی کمرے میں رہی تھیں جانتی تھی کہ وہ رکے گی نہیں اور وہ خود بھی اس کی خودداری مجروح نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کوئی بوجھ نہیں ہو تم ہم پر، ہر انسان اپنے حصے کا رزق کھاتا ہے۔ اللہ نے تمہارا رزق یہاں لکھ دیا ہے اور

ہم تو بہت خوش ہیں، تمہارے اور تمہاری اماں کے آنے سے کہیں جانے کی ضرورت نہیں......'' انہوں نے اون سلائیاں تخت پر رکھیں اور کھڑی ہوگئیں۔

''ذرا کچن میں جا کر دیکھوں کہ ماسی نے سبزی وغیرہ کاٹ دی ہے یا ابھی تک لے کر بیٹھی ہوئی ہیں۔'' جو ماسی برتن دھوتی اور کچن سمیٹتی تھی وہ ہی سبزی وغیرہ کاٹ دیتی تھی اور آٹا گوندھ دیتی تھی۔

''سن لیا اماں کیا کہہ رہی ہیں میری......'' رابعہ نے جتاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہم وہاں کیسے جائیں گے، تم نے سب پوچھ لیا ہے ناں کوثر سے کہ کہاں جانا ہے۔ گاؤں کا کیا نام ہے......؟'' اب اسے ایک اور فکر لگ گئی تھی۔

''پوچھ لیا ہے لیکن رات کو وہ فون کرے گی پوچھ لینا سب......تین منٹ کی کال بک کروائی تھی۔ پھر دوبارہ نہیں کروائی اسے کہیں جانا تھا اس لیے......'' وہ اٹھ کر اپنی اماں کی جگہ پر تخت پر بیٹھ گئی اور دیوار سے ٹیک لگا کر ڈائجسٹ کھولا۔

''سیالکوٹ تک ابا تمہیں چھوڑ آئیں گے...... وہاں سے پھر گوجرانوالہ جانا ہے......گوجرانوالہ اسٹاپ سے ہی اس کے گاؤں میں جانے کے لیے سوزوکی مل جائے گی۔''

''نہیں، نہیں انہیں کیوں تکلیف دو گی تم......ہم خود چلے جائیں گے بس ہمیں یہاں سے کوچ پر بٹھا دینا۔ کیا یہاں سے ڈائریکٹ گوجرانوالہ کوئی سواری نہیں جاتی......'' نتاشہ فوراً بولی۔

''جاتی ہوگی مجھے کیا پتا......؟'' رابعہ نے کندھے اچکائے۔

''لمبا سفر ہے، سیالکوٹ میں میری پھپھو ہیں، ابا جاتے رہتے ہیں ان سے ملنے......تم ایک دن وہاں آرام کرنا اگلے دن صبح وہ تمہیں گوجرانوالہ والی کوچ یا بس میں بٹھا دیں گے۔'' اس نے خود ہی خود پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔

''لیکن اتنی دور وہ ڈرائیو کر کے جائیں گے۔'' وہ متذبذب سی اسے دیکھنے لگی تھی۔ ''بس ہم چلے جائیں گے خود......''

''ہاں پتا ہے بہت بہادر ہو تم......اپنے شہر کے علاوہ اور کتنے شہر دیکھ رکھے ہیں تم نے اور ابا لمبی ڈرائیور نہیں کرتے کسی ڈرائیور کو ہائیر کر لیتے ہیں۔ اور ہاں ابھی مہینے ڈیڑھ مہینے بعد پنجاب کے اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو جائیں گی۔ سیدھی میرے پاس آنا۔ بلکہ سیالکوٹ پھپھو کے گھر چلی جانا وہاں سے ان کا ڈرائیور چھوڑ جائے گا یہاں......''

اور رابعہ کی اس محبت اور خلوص پر اس کا دل بھر آیا۔ آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ تو بعد کے بھی پلان بنائے بیٹھی تھی۔

''رابی تم......''

''بس......'' اس نے ہاتھ اٹھایا۔

''اب اس وقت تک مجھے ڈسٹرب نہ کرنا جب تک میں دونوں قسطیں ختم نہ کر لوں......''

اور وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اماں کو دیکھنے لگی جو بے حد افسردہ سی کسی سوچ میں گم تھیں۔

''کیا سوچ رہی ہیں اماں......؟'' اس نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''کچھ نہیں......'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''کمرے میں جا رہی ہوں کچھ دیر لیٹوں گی......سر بھاری، بھاری ہو رہا ہے۔''

وہ بھی ان کے پیچھے ہی کمرے میں آ گئی۔ وہ لیٹیں تو ان کے پاس بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگی۔ رابعہ کے کمرے کے ساتھ ہی یہ کمرا تھا جسے رابعہ نے ان کے لیے سیٹ کر دیا تھا۔

''رہنے دو اب اتنا بھی درد نہیں ہے۔'' انہوں نے منع کیا لیکن وہ ہولے، ہولے ان کا سر دباتے ہوئے کوثر کے متعلق اور اپنی جاب کے متعلق بتانے لگی۔

''یہ عارضی جاب ہے اماں...... جب گورنمنٹ کی طرف سے وہاں کوئی ٹیچر آ جائے گی تو ختم ہو جائے گی......پھر ہم لاہور چلے جائیں گے وہاں میرا بچپن اور لڑکپن گزرا ہے۔ بابا کی قبر ہے وہاں......وہاں کے گلی کوچوں سے مانوس ہیں ہم......ساری زندگی ہم کسی کے گھر نہیں رہ سکتے چاہے کوئی کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو......رابی کی شادی ہو جائے گی، وہ انگلینڈ چلی جائے گی۔ اس کے بھائی پہلے ہی وہاں ہیں کیا خبر اس کے اماں ابا بھی چلے جائیں تو اس وقت کوئی ٹھکانا ڈھونڈنے کے بجائے بہتر نہیں ہے کہ ابھی سے کوئی بندوبست کر لیں۔

ابھی صرف میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں...... جب تک وہاں کوئی ٹیچر نہیں آتی جاتی وہیں جاب کروں گی۔ پھر تھوڑا زیور بیچ کر میں بی ایڈ میں ایڈمیشن لے لوں گی......

رابعہ نے بتایا تھا کہ پہلے تو گورنمنٹ اسکولوں میں ایم اے پاس ٹیچرز کے لیے بی ایڈ کرنا ضروری نہیں تھا لیکن اب شاید ضروری ہے۔ بی ایڈ کرلوں گی تو شاید جاب بھی جلدی مل جائے۔ کوثر کی امی گورنمنٹ اسکول کی ٹیچر ہیں بلکہ ہیڈ مسٹریس ہیں ان کے پاس سب معلومات ہوں گی۔ تب ہم وہاں لاہور میں ایک کمرے والا چھوٹا سا کوئی فلیٹ یا گھر کرائے پر لے لیں گے۔"

اماں آنکھیں موندے خاموشی سے سن رہی تھیں۔ وہ خاموش ہوئی تو آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ مدھم سا مسکرائیں۔

"بہت آگے تک سوچ لیا ہے تم نے......؟"

"جی اماں...... اول تو وہاں اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی سائنس ٹیچر نہیں آئے گی...... دو سال ہو گئے ہیں اسکول کو ہائی ہوئے ابھی تک کوئی ٹیچر نہیں بھیجی محکمے نے، اب کوثر وہاں بائیو اور میتھس پڑھا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ دو سال تک بھی کوئی ٹیچر نہیں آئے گی۔ تو جب تک رابعہ کی شادی نہیں ہوجاتی ہم چھٹیوں میں یہاں آجائیں گے پھر لاہور چلے جائیں گے۔"

اس نے تھوڑی سی دیر میں کئی سال تک کا سوچ لیا تھا۔ لیکن انسان جو کچھ سوچتا ہے ضروری نہیں ہے کہ ویسا ہی ہو......

"لیکن زیور انتہائی مجبوری میں ہی فروخت کروں گی میں، زیادہ نہیں ہے بس چھ چوڑیاں ہیں اور ایک ہلکا سا لاکٹ سیٹ ہے اور دو چار انگوٹھیاں...... لاکٹ سیٹ تمہارے بابا نے مجھے رونمائی میں دیا تھا اور چوڑیاں امن کی پیدائش پر...... میں نے سارا زیور بیچ دیا لیکن یہ تمہارے بابا نے نہیں بیچنے دیا۔"

"اور میری پیدائش پر بابا نے کچھ نہیں دیا تھا؟" اس نے حلق میں اکٹھے ہوجانے والے نمکین پانی کے قطروں کو اپنے اندر اتارا۔

"کنگن دیے تھے...... آخری کیمو جب ہوئی تب ان کی وفات سے چند دن پہلے ہی بیچے تھے اور اسپتال کا بل ادا کیا تھا۔" ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

"ابھی یہ زیور ساتھ لے کر نہیں جائیں گے، تمہاری دوست کی اماں کے پاس ہی رکھ جائیں گے۔ بس انتہائی ضرورت کی چیزیں اور چند جوڑے کپڑے رکھ لینا جو کچھ فالتو سامان ہے یہاں ہی ایک بیگ میں ڈال کر رکھ جانا۔ صرف ایک ہی بیگ ساتھ لے جائیں گے۔ کیا پتا تم وہاں سیٹ نہ ہوسکو اور واپس آنا پڑے۔"

"سیٹ تو ہونا پڑے گا۔ دل لگے یا نہ لگے...... یہاں کون سا ہمارا اپنا گھر ہے کہ سیٹ نہ ہونے پر واپس آکر بیٹھ جائیں گے۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔ اور اماں کی طرف دیکھا۔ جو بات کر کے کسی سوچ میں گم ہو گئی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں اماں؟"

"بس یوں ہی سوچ رہی تھی، کیا تھا اگر افضل بھائی، جواد کے لیے مجبور نہ کرتے تو آج ہم جگہ جگہ دھکے نہ کھاتے سکون سے رہ رہے ہوتے۔" دکھ میں ڈوبا لہجہ، نم آنکھیں نتاشہ کو تڑپا گئیں۔ اس نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"اماں پلیز مجھے معاف کر دیجیے، میری وجہ سے آپ کو گھر چھوڑنا پڑا۔ وہ گھر جس نے ہمیں پناہ دی تھی۔ میں نے سوچا تھا اماں ان کے احسانات کے بدلے کے لیے میں ماموں کی بات مان لوں لیکن میں خود کو جواد کے ساتھ شادی کے لیے تیار نہیں کر سکی۔ بھلا کیسے ایک نیم پاگل ابنارمل شخص کے ساتھ...... میں مرجاتی اماں...... میری اس نافرمانی کے لیے مجھے معاف کردیں پلیز......" اب وہ زارو قطار رو رہی تھی۔ انہوں نے بے اختیار اسے گلے لگالیا۔

"پاگل ہو تاشی...... میں بھلا اپنی بیٹی کی شادی ایک ابنارمل سے کیوں کرتی، تم خود کو اس قربانی کے لیے راضی بھی کر لیتیں تب بھی نہیں...... تمہاری شادی تو......" اور ان کے تصور میں ایک خوب صورت وجیہہ شخص کی شبیہہ ابھری۔ انہیں حوصلہ دیتا شخص نرمی سے دھیمے، دھیمے لہجے میں بات کرتا کتنا اچھا اور محبت کرنے والا تھا وہ۔ ان کے لبوں سے آہ نکلی...... اور وہ بھی نتاشا کی طرح ہی رونے لگیں۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے رو رہی تھیں۔ اور کھلے دروازے میں کھڑی رابعہ ڈائجسٹ ہاتھ میں پکڑے حیرت سے انہیں یوں روتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

ناولٹ

تمہارے کھوج میں

نگہت سیما

دوسرا حصہ

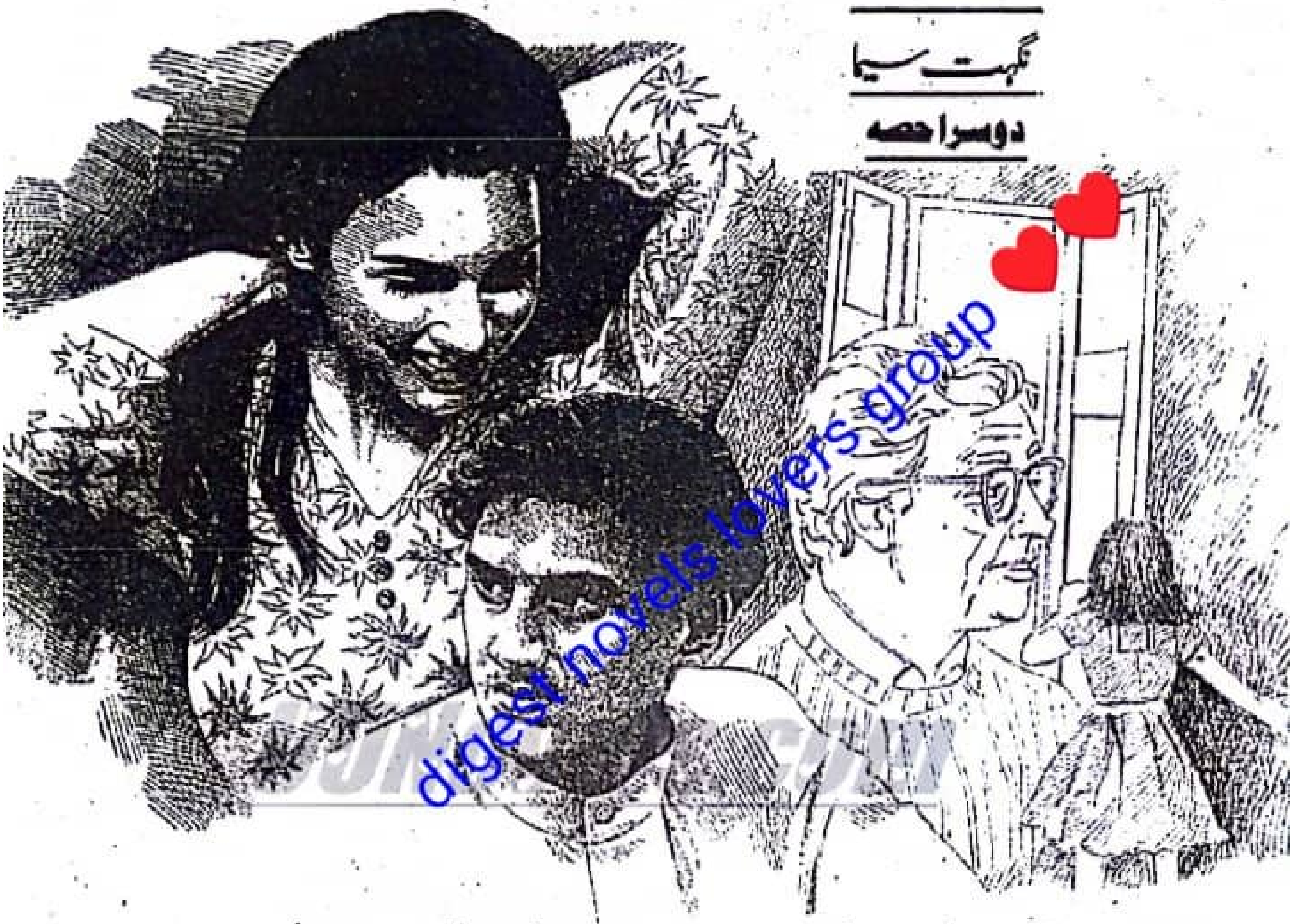
digest novels lovers group

آج چھٹی تھی اور وہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں اخبار تھا لیکن وہ پڑھ نہیں رہے تھے۔ وہ کچھ الجھے ہوئے سے تھے۔ کرن وہاں ہی کارپٹ پر اپنا ڈول ہاؤس لیے بیٹھی تھی اور اس میں سب سامان سجا رہی تھی۔ پاس ہی اس کی ڈولز اور دوسرے کھلونے بھی پڑے تھے۔

''بابا......!'' وہ اٹھ کر ان کے پاس آئی اور ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر انہیں مخاطب کیا تو وہ چونکے۔

''بابا مجھے نانو کے گھر جانا ہے...... آج تو آپ کی چھٹی ہے ناں...... آپ بھی چلیں۔''

''نہیں میری جان، آج مجھے کچھ کام ہے پھر کبھی چلیں گے۔'' انہوں نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔

''اچھا آپ کو کام ہے تو مجھے چھوڑ آئیں۔ وہاں سین آنٹی بھی آئی ہوں گی۔ انہوں نے مجھ سے پرامس کیا تھا کہ وہ مجھے لاہور لے جائیں گی۔ zoo دکھانے......

''zoo (چڑیا گھر)'' انہوں نے دُہرایا۔

''نہیں بیٹا بھلا وہ کیوں لے کر جائیں گی... میں خود اپنی بیٹی کو لے کر جاؤں گا لیکن آج نہیں پھر کبھی۔'' انہیں حیرت ہوئی کہ سین بھلا کیسے اسے لاہور اکیلی لے جاسکتی ہے۔ یوں ہی کہہ دیا ہوگا۔

''بابا میں بہت بور ہو رہی ہوں...... رضوانہ باجی بھی تو چلی گئی ہیں۔''

رضوانہ دراصل اپنے شوہر سے ناراض ہو کر مہراں کے پاس آگئی تھی۔ اس کے ماں، باپ نے اسے واپس سسرال جانے کو کہا تھا کہ وہ تمہارا شوہر ہے، مارے یا گالیاں دے جیسے بھی رکھے وہاں ہی

رہو ہم نے ایک بار بیاہ دیا۔ اب اس گھر سے جنازہ ہی اٹھے تمہارا تو وہ سسرال واپس جانے کے بجائے مہراں کے پاس آ گئی تھی۔ کم عمر تھی زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی ہوگی۔ مزاج میں تھوڑی ضد تھی۔ مہراں نے ان سے پوچھ کر رکھ لیا تھا۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ کرن اس کے ساتھ خوش رہتی ہے تو انہوں نے کرن کے سارے کام اس کے سپرد کر دیے تھے۔ اور اب اس کا شوہر اسے منا کر لے گیا تھا۔

''ہاں وہ چلی گئی ہیں...... آپ خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ بڑی ہو گئی ہیں، خود تیار ہو سکتی ہیں تو میں نے اسے بھیج دیا۔'' انہوں نے اسے بہلایا۔

''لیکن وہ میرے ساتھ کھیلتی تھیں، مجھے کہانیاں سناتی تھیں اور مجھے ہوم ورک میں بھی ہیلپ کرتی تھیں۔''

''اچھا......'' ان کے علم میں نہیں تھا کہ رضوانہ کچھ پڑھی لکھی بھی ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ بے حد مصروف تھے ورنہ وہ خود کرن کو ہوم ورک کرواتے تھے۔ وہ آفس سے اٹھتے تو اُن کی کھوج میں پھرتے رہتے تھے۔ اور گھر آتے تو اتنے تھکے ہوئے ہوتے کہ کرن کو پڑھانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔

''آپ رضوانہ باجی کو واپس بلا لیں ناں......''

''وہ تو ابھی نہیں آ سکتیں، میں اپنی بیٹی کو خود ہوم ورک کرواؤں گا...... ٹھیک ہے ناں......''

''جی......'' اس نے سر ہلایا۔

''اور کہانیاں بھی سنائیں گے؟''

''ہاں کہانیاں بھی سناؤں گا......'' اور اپنی عادت کے مطابق ضد اور بحث کیے بغیر وہ پھر جا کر کھلونوں سے کھیلنے لگی۔

''بچے کتنی ضدی، اور شرارتی ہوتے ہیں لیکن کرن ذرا بھی نہیں تھی۔ شاید اس کے اندر کہیں احساس ہے کہ وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم ہے۔ سال پہلے تک وہ اکثر پوچھتی تھی کہ اس کی ماما کہاں ہیں، اس کے پاس کیوں نہیں رہتیں۔ لیکن اب اس نے اپنی ماما کے متعلق پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔'' وہ سوچ رہے تھے۔

''تو بابا ہم پھر کب جائیں گے zoo دیکھنے؟'' اب وہ بلاکس جوڑ کر کوئی عمارت بنا رہی تھی۔ اس نے اپنے سارے کھلونے سمیٹ کر باسکٹ میں ڈال دیے تھے۔

''کچھ دنوں تک بیٹا......'' وہ نرمی سے بولے تھے انہیں لاہور تو جانا ہی تھا۔ ایک بار پھر ان ہی گلی کوچوں کی خاک چھاننے جہاں سے ان کے متعلق کچھ معلوم ہونے کی امید تھی۔ شاید اب کہیں سے کوئی سراغ مل جائے۔ لیکن دو سال میں تو وہ انہیں تلاش نہیں کر پائے تھے تو اب چھ ماہ میں کیسے تلاش کریں گے۔ یہ الگ بات تھی کہ ان دو سالوں کے ابتدائی چند ماہ میں ہی انہوں نے انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ پھر مایوس ہو کر یہ کوشش ترک کر دی تھی لیکن ڈاکٹر داؤد نے لاہور میں کئی لوگوں سے کہہ رکھا تھا کہ جیسے ہی ان کے متعلق کچھ پتا چلے انہیں اطلاع دے دیں۔ بس اسی ایک آس میں وہ ابھی تک یہاں ٹکے ہوئے تھے کہ شاید کہیں سے کوئی اطلاع مل جائے۔

لیکن اب ایک بار پھر نئے سرے سے انہیں اُن کا کھوج لگانا تھا۔

''لیکن بابا...... وہ سیین آنٹی کہتی ہیں، بابا کے پاس وقت نہیں ہوتا کہ وہ تمہیں کہیں گھمانے لے جائیں۔'' اسے بلاکس جوڑتے، جوڑتے اچانک یاد آیا تھا۔

''وہ کہتی ہیں سب بچوں کے بابا مصروف ہوتے ہیں۔ انہیں آفس کے اور باہر کے سارے کام کرنے ہوتے ہیں۔ پھر وہ گھر آتے ہیں تو تھکے ہوئے ہوتے ہیں تو سب بچوں کو ان کی ماما ہی گھمانے اور شاپنگ کروانے اور فرینڈز کی طرف لے کر جاتی ہیں لیکن میری چونکہ ماما نہیں اس لیے سیین آنٹی مجھے سیر کرواتے بھی لے کر جائیں گی اور شاپنگ کروانے بھی۔''

''یہ سیین......'' انہیں سیین پر غصہ آیا۔

''کیا چاہتی ہے آخر......؟'' دل ہی دل میں کہتے ہوئے وہ اپنی طرف دیکھتی کرن کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

''ہاں سب بچوں کے بابا مصروف ہوتے ہیں، تھکے ہوئے بھی ہوتے ہیں لیکن ... اپنے بچوں کے لیے وہ

وقت نکال لیتے ہیں اور بالکل بھی نہیں تھکتے...... پھر سنڈے بھی تو ہوتا ہے ناں فارغ......''

وہ سیبن کی بات جھٹلانا نہیں چاہتے تھے کہ کرن سیبن پر بہت ٹرسٹ کرتی تھی۔

''اور آپ کے بابا کے پاس تو آپ کے لیے بہت وقت ہے۔ آپ نے جہاں جانا ہے بابا آپ کو لے جائیں گے اور شاپنگ بھی کروادیں گے۔''

''اوکے بابا......!'' وہ پھر بلاکس کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا اور اپنا فون اٹھا کر باہر آگئے اور پھر سیبن کا نمبر ملاتے، ملاتے وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے لان میں آگئے تھے۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ کرن ان کی بات سنے۔

''اوہ زہے نصیب' یہ آج آپ نے مجھ غریب کو کیسے یاد کرلیا۔'' سیبن نے فون اٹھاتے ہی کہا تو ناگواری سے ان کی پیشانی پر شکنیں سی پڑ گئیں۔

''یہ تم میری بیٹی کو کیا پٹیاں پڑھاتی رہتی ہو......''

''کیا......؟ میں نے بھلا کیا پٹیاں پڑھائی ہیں اسے۔'' وہ کچھ ناراض اور کچھ حیران سی ہوئی تھی۔

''کیوں، کیا تمہیں نہیں پتا کہ کیا پٹیاں پڑھاتی ہو تم اسے...... اگر اسے زو دیکھنا ہے۔ شاپنگ کے لیے جانا ہے تو میں ہوں ناں کسی دوسرے تیسرے کو اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔''

''واہ...... تیمور صاحب واہ...... ایک تو میں آپ کی بیٹی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں، کمپنی دیتی ہوں، خالہ کی طرف آتی ہے تو پارک لے کر جاتی ہوں اس خیال سے کہ بیچاری کی ماں نہیں ہے' یہ تو وہی نیکی برباد گناہ لازم والی بات ہوگئی۔ کمال ہے تیمور بجائے اس کے آپ میرے ممنون ہوں کہ میں آپ کی بیٹی کا خیال رکھتی ہوں، آپ مجھے غصہ دکھا رہے ہیں اور ناراض ہو رہے ہیں۔''

وہ ان کی بھتیجی زاد تھی۔ بچپن میں ساتھ کھیلتے کودتے تھے بے تکلفی تھی گو وہ ان سے دو سال چھوٹی تھی لیکن بچپن سے ہی وہ انہیں نام لے کر بلاتی تھی۔

''تم اگر واقعی اس کا خیال رکھنے اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کررہی ہوتیں تو میں ضرور تمہارا شکرگزار ہوتا لیکن تم اسے یہ احساس دلانا چاہتی ہو کہ اس کی ماں نہیں ہے۔ اس لیے دوسروں کو اس پر ترس کھانا چاہیے۔ مہربانی کرکے آئندہ میری بیٹی پر ترس کھانے اور ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور خبردار جو پھر کبھی اس کے لیے ''بیچاری'' کا لفظ استعمال کیا۔'' وہ تلخ ہوئے تھے۔

''بے شک آپ کرن کی ہر خواہش پوری کرسکتے ہیں لیکن ماں کی کمی پوری نہیں کرسکتے۔ بچوں کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے تیمور...... خاص طور پر بچیوں کو...... آپ یقیناً بہترین باپ ہوسکتے ہیں لیکن ماں کے نہ ہونے سے جو تشنگی اس کی زندگی میں رہ جائے گی وہ کبھی ختم نہیں ہو گی۔'' سیبن نے ان کے لہجے کی تلخی کو نظرانداز کیا۔

''اور پھر ایک عمر ہوتی ہے جب بچیوں کو ماں کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''تو تب دیکھا جائے گا ضرورت ہوئی تو ماں بھی آجائے گی اس کی۔'' لہجے میں اب بھی تلخی تھی۔

''ابھی اس عمر میں اسے کسی بھی عورت کو ماں قبول کرنے میں آسانی ہوگی لیکن جب اس کی عمر زیادہ ہوجائے گی تو مطلب سمجھدار ہوجائے گی تو کسی دوسری عورت کو ماں کی حیثیت دینا اس کے لیے مشکل ہوگا۔''

''تمہارے مشورے کا بہت شکریہ...... پھر بھی میں چاہوں گا کہ آئندہ تم کرن سے اس طرح کی باتیں نہیں کروگی نہ ہی خود سے زیادہ اٹیچڈ کرنے کی کوشش کروگی......'' اب کے انہوں نے لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''تمہیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن کرن کے لیے مشکل ہوگی۔ جب ہم واپس چلے جائیں گے تو وہ ڈسٹرب ہوگی بہت... اور میں نہیں چاہتا کہ وہ تم سے اتنی اٹیچڈ ہوجائے کہ تمہاری وجہ سے اداس اور دکھی ہو۔''

''کیا مطلب...... کیا آپ واپس چلے جائیں گے؟''

سیبن کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان

آ گئے ہیں اور پھر وہاں اب ان کا تھا ہی کون...... یہاں تو عزیز رشتے دار تھے۔

"مجھے یہاں ہمیشہ نہیں رہنا سبین...... شاید بہت جلد واپس چلا جاؤں...... اس لیے میں نہیں چاہتا کہ کرن تم سے اتنی مانوس ہو جائے کہ اس کے لیے بچھڑنا مشکل ہو جائے۔" انہوں نے صاف، صاف بات کرنے کا سوچا تھا کہ اگر سبین کے دل میں ایسا کوئی خیال ہے ان کے حوالے سے جیسا کہ دادا جان چاہتے تھے تو وہ نکل جائے۔

"لیکن وہ بچھڑے ہی کیوں مجھ سے...... ہم ہمیشہ بھی تو ساتھ رہ سکتے ہیں تیمور...... اسے ماں کی ضرورت ہے اور کیا میں اس کی ماں نہیں ہو سکتی......" وہ کچھ منہ پھٹ اور بے باک تو بچپن سے ہی تھی جو بات دل میں ہوتی صاف منہ پر کہہ دیتی لیکن وہ اس طرح اتنی بے باکی سے بغیر جھجکے اپنی خواہش کا اظہار کر سکتی تھی، تیمور علی کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ لمحہ بھر کے لیے وہ اس کی اس جرأت پر خاموش ہو گئے تو چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پھر بات شروع کی۔

"آپ کو کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہی ہے ناں...... اپنے لیے نہ سہی کرن کے لیے...... میں پھر کہوں گی کہ ابھی وہ چھوٹی ہے، آپ کی بیوی کو قبول کر لے گی۔ ہو سکتا ہے بعد میں نہ قبول کر سکے تو اس صورت میں وہ خوش رہ سکے گی نہ آپ...... بچے محبتوں کو پہچانتے ہیں تیمور...... میں اسے محبت دوں گی، ممتا دوں گی تو وہ مجھے ہی اپنی ماں سمجھنے لگے گی۔ اور مجھے تو وہ ہے ہی بہت پیاری، میری بہت پیاری بہنوں جیسی کزن میری آمنہ آپی کی بیٹی ہے۔ مجھے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہو گی...... اب بھی ہے...... اور وہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے، پیار کرتی ہے مجھ سے...... خوش رہتی ہے میرے ساتھ......" تیمور حیران سے اسے سن رہے تھے پھر غصہ ہو لے، ہولے ان کے اندر بل کھانے لگا۔

"وقت اور عمر نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا سبین...... تم اب بھی ویسی ہی ہو بغیر سوچے سمجھے بولنے والی۔" اس کے خاموش ہوتے ہی وہ بولے تھے۔

"بغیر سوچے سمجھے......" اس کی آواز ذرا سا بلند ہوئی۔

"ہرگز نہیں...... میں نے بہت سوچ سمجھ کر سب کچھ کہا ہے۔ اب آپ کو سوچنا چاہیے تیمور جو کچھ میں نے کہا اس پر......"

"میں تمہیں کتنی بار کہہ چکا ہوں سبین کہ میں تم سے بڑا ہوں...... اور مہربانی کر کے میرے نام کے ساتھ بھائی لگایا کرو......" انہیں کچھ سمجھ نہیں آئی کہ اس کی بات کا کیا جواب دیں تو بلاوجہ اعتراض کیا۔ حالانکہ جانتے تھے کہ بچپن میں پھپھو اسے کہہ، کہہ کر تھک گئی تھیں لیکن اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ "یہ میرے بھائی نہیں ہیں تو پھر کیوں بھائی کہوں......" یقیناً آج بھی اس کا وہی جواب ہوگا۔

"جب میں آپ کو بھائی نہیں سمجھتی تو بھائی کیوں کہوں......" وہ ہولے سے ہنسی تو جھلا کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

جب پاکستان آنے کے فوراً بعد دادا جان نے ان سے سبین کی بات کی تھی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا کہ انہیں سبین سے شادی نہیں کرنی اگر انہوں نے بابا سے کوئی وعدہ نہ بھی کیا ہوتا اور کرن کا بھی کوئی مسئلہ نہ بھی ہوتا تو تب بھی انہیں سبین سے شادی نہیں کرنی تھی۔ اسفند کی شادی کے وقت بھی یہ ذکر چلا تھا کہ تیمور کی شادی سبین سے کر دی جائے اور تب بھی انہوں نے بابا جان کو منع کر دیا تھا۔ وہ بچپن سے ہی سبین کے مزاج کی وجہ سے اس سے چڑتے تھے۔ گھر والے جسے اس کی صاف گوئی کہتے تھے وہ انہیں بدتمیزی لگتی تھی۔ انہیں دھیمے مزاج والی لڑکیاں پسند تھیں۔ لیکن کرن اب اس سے نہ صرف بہت مانوس ہو گئی تھی بلکہ اسے پسند بھی کرنے لگی تھی۔ جب بھی اپنی نانو کے گھر سے ہو کر اور سبین سے مل کر آتی تو سبین کے متعلق ہی باتیں کرتی رہتی...... اور یہ اچھا نہیں تھا۔ بہتر یہ تھا کہ وہ آئندہ کرن کو نانو کے گھر رہنے کے لیے نہ جانے دیں...... خود ہی

ان سے ملانے کے لیے لے کر جائیں اور اپنے ساتھ ہی لے آئیں تا کہ بین کے ساتھ اسے زیادہ رہنے کا موقع نہ ملے......دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے وہ پورچ میں آئے۔ کریم پائپ لگائے گاڑی دھو رہا تھا۔ ڈرائیونگ کا تو اسے کم ہی موقع ملتا تھا کہ زیادہ تر وہ خود ہی ڈرائیو کرتے تھے۔ یہ خواہ مخواہ دادا جان کی ضد تھی کہ کریم وہاں ہی رہے ان کے پاس......"بھلے تم خود ڈرائیو کر لیتے ہو لیکن کبھی آدمی بیمار بھی ہو جاتا ہے سو مسئلے ہو سکتے ہیں۔" یہ ان کا کہنا تھا۔

"کریم گاڑی دھو کر ٹینکی فل کروالاؤ......"

ان کا ارادہ اچانک ہی لاہور جانے کا بن گیا تھا۔

"آج چھٹی ہے تو بہتر ہے کہ آج ہی کرن کو ز و دکھا لاؤں......پھر اگلے سنڈے تک کافی دن ہو جائیں گے اور وہ سوچتی رہے گی کہ پتا نہیں میں اسے لے کر بھی جاؤں گا یا نہیں...... پھر لاہور جا کر ایک بار پھر انہیں تلاش کرنے کی مہم شروع کرتا ہوں اگر وقت مل گیا تو دو تین جگہ سے ان کے متعلق پتا کروں گا نہیں تو پھر چند دن کی چھٹی لے کر چلا جاؤں گا۔ اور کرن کو گاؤں تنویر چاچو کے گھر چھوڑ جاؤں گا۔ چاچی کرن سے بہت پیار کرتی ہیں۔" انہوں نے کریم کی طرف دیکھا جو چاروں طرف کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

کسی خیال کے تحت انہوں نے ڈاکٹر داؤد کا نمبر ملایا۔ اور کریم سے مخاطب ہوئے۔

"جلدی کام ختم کرو مجھے ابھی لاہور جانا ہے۔"

"جی......" وہ جواب دے کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تو بالکل غیر ارادی طور پر وہ انیکسی کی طرف چل پڑے۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی لیکن ڈاکٹر داؤد نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ وہ انیکسی سے کچھ فاصلے پر رک گئے تھے اور ایک دم ہی ان کی نظر انیکسی کی طرف اٹھی تھی۔ دروازہ کھلا تھا، وہ دروازے میں کھڑی باہر موجود مہراں سے کوئی بات کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہری تھیں اور پھر فوراً ہی انہوں نے نظریں جھکالی

تھیں۔ ڈاکٹر داؤد صحیح ہی تو کہتے تھے ایسا غارت گر حسن کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتا ہے۔ آج دس دن ہو گئے تھے اسے ان کی انیکسی میں رہتے ہوئے لیکن ڈاکٹر داؤد تھے کہ مطمئن ہی نہیں ہو رہے تھے۔

"کیا کروں یار جس ادارے کا بھی پتا کرتا ہوں اسی کا کوئی نہ کوئی اسکینڈل نکل آتا ہے اور مسز انصاری ہیں کہ ابھی تک کراچی میں ہی ہیں۔"

"ایسا تو نہیں ہو سکتا داؤد کہ کوئی ایک ادارہ بھی ایسا نہ ہو جہاں لاوارث لڑکیاں محفوظ رہ سکیں۔" انہیں حیرت ہوئی تھی۔

"ہوں گے ضرور ہوں گے لیکن میں نے اب تک جن کے متعلق پتا کیا ہے وہ بہر حال قابل اعتبار نہیں ہیں۔ ویسے تمہیں کیا کہہ رہی ہے یہ، خاموشی سے انیکسی میں رہ رہی ہے۔ کم از کم یہ اطمینان تو ہے مجھے کہ یہاں محفوظ ہے۔"

"وہ تو محفوظ ہے لیکن میں بالکل بھی محفوظ نہیں ہوں......" بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"وہ کیسے......؟" ڈاکٹر داؤد نے قہقہہ لگایا تھا۔

"تمہیں کیا خطرہ ہے اس بیچاری، بے ضرر لڑکی سے...... یقین مانو......ہم نے اس سے جو دو تین ملاقاتیں کی ہیں اس کے بعد تمہیں اتنا یقین دلا سکتے ہیں کہ وہ نہ تو دہشت گرد ہے نہ چور ڈاکو جو کسی روز تمہارا گھر لوٹ کر چلی جائے گی۔"

اتنا تو وہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ کوئی چور ڈاکو نہیں ہے۔ مصیبت کی ماری ہے جو اپنی زندگی ختم کرنے چلی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھے کہ اس نے سب سچ نہیں بتایا تھا اس نے ڈاکٹر داؤد کو حادثے کی جو تاریخ بتائی تھی اس تاریخ کو وہاں سیالکوٹ کے گرد و نواح بلکہ گوجرانوالہ تک کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر داؤد نے اس مقصد سے تاریخ پوچھی تھی کہ اپنے طور پر پتا کروائیں گے کہ اس روز ہونے والے حادثے کے زخمیوں کو کس، کس اسپتال میں رکھا گیا تھا۔ کیا خبر اس لڑکی کی والدہ زندہ ہو اور بتانے

والے نے اسے غلط بتایا ہو..... چونکہ حادثے کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے آسانی سے معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس تاریخ کو اور آس پاس کی تاریخوں میں بھی اس طرح کا کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ تقریباً ایک ماہ پہلے ایک حادثہ اس روڈ پر ضرور ہوا تھا۔ لیکن وہ تو ابھی کی بات کر رہی تھی۔ اگر وہ جھوٹ بول رہی تھی تو کیوں..کیا مقصد تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر داؤد نے منع کر دیا تھا۔

''رہنے دو یار جس مقصد سے بھی اس نے غلط بیانی کی ہے ہمیں اس سے کیا..... اللہ نے اسے ہم تک پہنچایا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اسے ہم کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیں۔''

''اور یہ محفوظ ٹھکانا جانے کب تک ڈھونڈ پائیں گے آپ.....؟'' دراصل انہیں ڈر تھا کہ اگر دادا جان کو خبر ہو گئی کہ یہاں ان کے گھر کی انیکسی میں ایک لڑکی رہ رہی ہے تو پھر خیر نہیں، اور پھر پھپھو وغیرہ نے کہانیاں گھڑنے میں دیر نہیں لگانی تھی اور یہ کریم اس پر تو انہیں ذرا بھی اعتبار نہیں تھا۔ انہیں لگتا تھا جیسے دادا جان نے اسے یہاں ان کی جاسوسی کے لیے بھیج رکھا ہو۔ ورنہ یہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بوقت ضرورت رفیق بھی ڈرائیور کر سکتا تھا۔

''یار پڑھی لکھی ہے، سمیرا نے بتایا تھا کہ ماسٹر کر رکھا ہے اس نے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اسے ملازم رکھ لو..... رضوانہ کے چلے جانے سے تم بتا رہے تھے کہ کرن اداس اور پریشان ہے یہ کرن کو پڑھا بھی دے گی اور اس کا خیال بھی رکھ لے گی۔ تم مناسب سی تنخواہ دے دینا۔ اسے بھی ٹھکانا مل جائے گا، تمہیں بھی کرن کی طرف سے پریشانی نہیں رہے گی۔'' ڈاکٹر داؤد نے مشورہ دیا تو انہوں نے ناراضی سے انہیں دیکھا تھا۔

''میں نے جو سمیرا بھابی سے ٹیوٹر کے لیے کہا ہے تو اس لیے کہ وہ کرن کو ہوم ورک وغیرہ کروا دیا کرے.....اور وہ صرف گھنٹا بھر کے لیے آتی اور کرن کو پڑھا کر اور ہوم ورک کروا کر چلی جاتی اور جہاں تک خیال رکھنے کی بات ہے، رضوانہ کے آنے سے پہلے بھی مہراں اس کا خیال رکھتی تھی اب بھی وہ ہی رکھ رہی ہے۔''

''ہاں لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ مہراں کی کمپنی انجوائے نہیں کرتی..... جس طرح رضوانہ کے ساتھ خوش رہتی تھی اس طرح اس کے ساتھ بھی خوش رہے گی۔''

ڈاکٹر داؤد کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

''سوری..... داؤد بھائی میں اسے گھر پر رکھنا افورڈ نہیں کر سکتا جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس کا کوئی بندوبست کر دیں۔ پلیز.....'' اسفند علی کے دوست ہونے کی وجہ سے وہ کبھی انہیں داؤد بھائی کہہ کر بلاتے اور کبھی ڈاکٹر داؤد کہہ کر..... حالانکہ جب وہ پاکستان آئے تھے تو ڈاکٹر داؤد نے کہا تھا کہ وہ انہیں اسفند کی جگہ ہی سمجھیں..... بھائی دوست.....

''بیچاری کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے یار.....کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے یہاں سے نکل کر کہاں جائے گی۔ اکیلی، جوان لڑکی کو تو یہ انسان نما درندے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے..... تھوڑا سا صبر کر لو یار سمیرا کی مسز انصاری سے تفصیل سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ بہو اور بیٹے کے امریکا جانے کے بعد وہ یوں بھی اکیلی ہیں تو اسے اپنے پاس رکھ لیں گی۔ مسز انصاری کے علاوہ کسی اور پر ٹرسٹ نہیں کر سکتا.....''

اور وہ خاموش ہو گئے تھے کہ اتنے بھی سنگ دل نہیں تھے کہ اسے گھر سے نکال دیتے۔

''اب نہ جانے کب تک یہ گلے پڑا ڈھول بجانا پڑے گا۔'' سوچتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر ڈاکٹر داؤد کا نمبر ملایا۔ اس بار انہوں نے فوراً ہی اٹینڈ کر لیا۔

''داؤد بھائی میں کچھ دیر تک کرن کے ساتھ لاہور کے لیے نکل رہا ہوں۔ شام تک ان شاء اللہ واپس آ جاؤں گا.....''

''خیریت.....! یہ اچانک لاہور جانے کا پروگرام کیوں بنا لیا۔'' انہوں نے پوچھا۔

''سوچا ایک تو کرن کی آؤٹنگ ہو جائے گی۔ گھر

میں چھٹی والے دن اکیلی بور ہوتی رہتی ہے۔ دوسرے کچھ اُن لوگوں کے متعلق بھی پتا کرنے کی کوشش کروں گا......آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ ایک بار آپ نے بتایا تھا کہ آپ اسفند بھائی کے ساتھ شاہ میر تایا کو دیکھنے گئے تھے۔ وہ کون سا اسپتال تھا جہاں وہ ایڈمٹ تھے۔ اسفند بھائی نے بتایا تھا کہ وہاں اسپتال میں ہی اُن کی ڈیتھ ہوئی تھی۔ شاید وہاں ان کی کوئی فائل موجود ہو۔ ریکارڈ سے ایڈریس کا پتا چل سکے۔ بابا نے جو ایڈریس دیا تھا۔ اس پر تو وہ نہیں ملے تھے۔ کیا خبر وہاں کوئی اور ایڈریس لکھا ہو......گھر تبدیل کرلیا ہو اور بابا کے پاس پرانا پتا ہو......"

"کوشش کر کے دیکھ لو وہاں میرے ایک دوست ڈاکٹر ہیں......ڈاکٹر حبیب، کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو ان سے مل لینا۔"

"شکریہ داؤد بھائی لیکن ہوسکتا ہے میں لیٹ ہو جاؤں......تو سمیرا بھابی سے کہیے گا کہ ایک چکر لگا لیں اس کے پاس۔ مہراں کچھ بے پروا ہے۔ اور یہ کریم جو ہے اس پر مجھے ذرا بھی اعتبار نہیں......میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے اندر اس لڑکی کو کوئی نقصان پہنچے۔ وہ جب تک میرے گھر میں ہے میری ذمے داری ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو سمیرا بھابی اسے ایک دن کے لیے اپنے ساتھ ہی لے جائیں گھر......"

وہ کہتے کہتے جھجکے تھے انہیں کریم بخش کی آنکھوں سے عیاری اور مکاری جھلکتی نظر آتی تھی۔ اور وہ اجنبی لڑکی ان کی پناہ میں تھی۔ مجبوراً ہی سہی وہ جب تک ان کے گھر میں تھی اس کی حفاظت ان کی ہی ذمے داری تھی۔

"دراصل سمیرا آج اپنی بہن کے گھر گجرات گئی ہوئی ہے۔ کل واپس آئے گی ورنہ میں سمیرا کو کہتا اسے ایک دن کے لیے گھر لے آئے۔ اور تم بھی بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ گھر میں مہراں ہے۔ اسے کہنا انیکسی میں ہی سو جائے......باہر چوکیدار ہے۔ انیکسی میں کون رہ رہا ہے۔ تمہارے ملازموں کو علم نہیں سوائے رفیق اور مہراں کے اور رفیق بقول تمہارے قابلِ اعتبار ہے۔ یوں بھی رات کو وہ گھر چلا جاتا ہے۔ چوکیدار اپنے کمرے (کیبن) میں ہوتا ہے تو باقی رہ گیا کریم......تو یار اسے ساتھ ہی لے جاؤ...... ڈرائیور ہے تو کس مقصد کے لیے ہے۔ وہ ڈرائیو کرے۔"

ڈاکٹر داؤد کے پاس ہر مسئلے کا فوری حل موجود ہوتا تھا۔

"یوں بھی دادا جان نے خود تمہیں کہا ہے کہ انہیں تلاش کرلو ان چھ ماہ میں تو اگر وہ بقول تمہارے دادا جان کا جاسوس ہے تو بتا دے انہیں کہ تم کسی کو تلاش کرنے لاہور گئے تھے۔ اب تو دادا جان سے چھپانے کی ضرورت نہیں ہے ناں......"

"جی بہتر......!"

انہیں ڈاکٹر داؤد کی بات پسند آئی تھی کہ کریم کو ساتھ لے کر جائیں۔ فون آف کر کے ان کی نظریں پھر انیکسی کی طرف اٹھی تھیں۔ اب دروازہ بند تھا لیکن مہراں ابھی تک وہاں ہی کھڑی شاید ان ہی کا انتظار کر رہی تھی جیسے ہی انہوں نے فون آف کیا وہ ان کی طرف بڑھی۔

"صاحب جی وہ......"

"میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا مہراں کہ جب تک وہ لڑکی یہاں ہے احتیاط کرنی ہے کہ کسی کی نظر نہ پڑے اور یہاں یہ احتیاط کی جا رہی ہے کہ دروازے پر کھڑے ہو کر گپیں لگائی جا رہی ہیں۔"

اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی انہیں خیال آیا تھا کہ ابھی چند لمحے پہلے وہ کس بے احتیاطی سے دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ کریم اور چوکیدار وغیرہ کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی پھر بھی احتیاط لازم تھی۔ کریم کا کوارٹر گھر کی پچھلی طرف موجود چھوٹے سے احاطے میں تھا۔ یہاں دو سرونٹ کوارٹر تھے جب سب لوگ یہاں رہتے تھے تو ملازم بھی زیادہ تھے لیکن اب دوسرا کوارٹر خالی تھا کبھی کبھار رفیق کو دیر ہو جاتی مہمانوں کی وجہ سے تو اِدھر ہی رہ جاتا تھا۔

"نہیں پہلے تو کبھی اس طرح بے احتیاطی نہیں کی صاحب بس وہ آج ہی بی بی مجھے کہنے آئی تھیں کہ انہیں

آپ سے بات کرنی ہے۔ دراصل میں آرہی تھی تو انہوں نے مجھے کمرے سے آواز دی تھی لیکن میں نے سنا نہیں تو وہ دروازے تک چلی آئیں۔ آئندہ خیال رکھوں گی اور بی بی کو بھی سمجھا دوں گی......'' مہراں سر جھکائے کھڑی تھی۔

''ٹھیک ہے جا کر کرن کو تیار کرو، ہمیں لاہور جانا ہے۔ ایک بیگ میں کرن کی ضروری چیزیں اور ایک جوڑا کپڑوں کا بھی رکھ دینا......کچھ کھانے پینے کا سامان سینڈوچ وغیرہ بھی......''

''جی صاحب......آپ فکر نہ کریں۔ میں کر لیتی ہوں سب......'' مہراں کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی احتیاطاً انہوں نے کہہ دیا تھا۔

''اور ہاں رات کو واپس آجائیں گے لیکن ہو سکتا ہے کچھ دیر ہو جائے تو رفیق بھائی کو بھیج دیجیے گا اور دروازہ لاک کر کے انیکسی میں ہی سو جایئے گا...... میرے پاس چابیاں ہیں۔''

انہیں خیال آیا تھا کہ کیا خبر اکیلے میں اسے خوف آتا ہو......جب سے یہ لڑکی آئی تھی مہراں انیکسی میں ہی سو رہی تھی لیکن رضوانہ کے جانے کے بعد وہ گھر کے اندر ہی سو رہی تھی کہ جب تک کرن سو نہیں جاتی وہ اس کے پاس ہی رہتی۔ پھر دل چاہتا تھا تو باہر لاؤنج میں بستر بچھا لیتی یا کرن کے کمرے میں ہی۔

''جی اچھا......'' مہراں چلی گئی تو انہوں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے اس کی آواز آئی۔

''آجائیں سر......''

شاید وہ ان کی ہی منتظر تھی کیونکہ وہ انہیں دیکھ چکی تھی جب مہراں سے بات کر رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ چھوٹا سا صحن عبور کر کے کمرے میں داخل ہوئے وہ سامنے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ دوپٹا اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے نگاہیں جھکائے۔

''مہراں کہہ رہی تھی کہ آپ کو مجھ سے کچھ بات کرنا تھی۔'' وہ دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے۔

''جی آپ سے ایک ریکوئسٹ کرنی تھی کہ مجھے اگر آپ کہیں جاب دلوا دیں کسی اسکول یا کالج میں ہو تو بہتر ہے۔ اس طرح اسکول یا کالج کے ہاسٹل میں رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ سمیرا بھابی نے بتایا تھا کہ ابھی تک رہائش کا بندوبست نہیں ہو سکا تو...... لیکن ایک پرابلم یہ ہے کہ میرے تمام کاغذات جس بیگ میں تھے وہ گاڑی کے حادثے کے وقت کھو گیا تھا۔ تو کیا مجھے میری ڈگری کی نقل وغیرہ مل سکتی ہے۔ میں نے قائداعظم یونیورسٹی سے ماسٹر کیا ہے۔''

اس نے ذرا کی ذرا کی نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا تو وہ جو بہت دھیان سے اس کی طرف ہی دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہے تھے چونکے لحہ بھر کے لیے نظریں اس کی نظروں سے ملی تھیں۔ بے پناہ خوب صورت آنکھیں تھیں۔ دونوں نے فوراً ہی نظریں جھکا لی تھیں۔

''جہاں تک رہائش کی بات ہے تو اس کا بندوبست تو سمیرا بھابی نے کر دیا ہے لیکن فی الحال مسز انصاری کراچی اپنی بیٹی کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ چند دنوں تک آجائیں گی۔ بہت اچھی اور شفیق خاتون ہیں ان کے ہاں آپ کو کسی طرح کا خوف یا ڈر نہیں ہوگا۔''

غیر ارادی طور پر وہ اسے تسلی دینے لگے تھے۔

''اور آپ کے کاغذات کی نقل ملے گی یا نہیں مجھے اس کے متعلق علم نہیں ہے، یہ تو پتا کروانا پڑے گا۔ ڈاکٹر داؤد سے بات کروں گا کیا خبر ان کا کوئی جاننے والا اسلام آباد میں ہو......'' وہ جو اس کے متعلق کچھ مشکوک سے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے اور ڈاکٹر داؤد سے اس کے متعلق انہوں نے کافی بحث بھی کی تھی کہ اگر اس تاریخ میں کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا تو ساری کہانی من گھڑت ہے اس وقت بنا کوئی بحث کیے جیسے اس کی بات پر یقین کر رہے تھے کہ واقعی اس کے تعلیمی کاغذات حادثے میں کھو گئے ہیں جس پر انہیں خود بھی حیرت ہوئی تھی......حالانکہ اس وقت وہ کہہ سکتے تھے کہ جب کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں تو کاغذات کیسے گم ہو گئے۔ لیکن پتا نہیں کیوں نہیں کہہ سکے تھے۔ کیا ان کے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا

ہو گیا تھا اور کیا...... وہ فوراً ہی وہ مڑے تھے۔

''اور ہاں......'' جاتے، جاتے وہ رکے تھے۔

''آپ آج دروازے پر کھڑی تھیں۔ آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ گھر کے اندر ہی رہا کریں...... اور میرے لیے بھی، میں یہاں اکیلا رہتا ہوں...... میری چھوٹی سی بیٹی ہے۔ اور مہراں کے علاوہ کوئی عورت نہیں ہے یہاں۔ میں نہیں چاہتا کہ ملازم یا کوئی اور آنے والا آپ کے اور میرے حوالے سے کوئی غلط بات کرے...... مجھے آپ کی اور اپنی عزت کا خیال ہے۔''

''جی......'' اس نے نظریں اٹھائیں...... ڈبڈبائی نظریں۔ اچانک ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور کتنے ہی لمحے نظریں نہ ہٹا سکے۔ سیاہ پانیوں میں جیسے دو جھلملاتے دیے روشن تھے۔

''آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟'' گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لب تھرتھرائے۔ اور پلکیں بھیگتی چلی گئیں۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے بمشکل نظریں ہٹائیں اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

بیگ میں سامان رکھتے ہوئے نتاشہ کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

''نہ جاؤ تاشو۔'' رابعہ کی پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔

''آخر تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟''

''بتایا تو تھا تمہیں کہ کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن ساری زندگی میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ زندگی رک جانے کا یا ٹھہر جانے کا نام نہیں ہے۔ مجھے رکنا نہیں ہے، آگے بڑھنا ہے، کچھ کرنا ہے۔'' وہ بولی۔

''میرے کچھ خواب ہیں جنہیں میں نے پورا کرنا ہے۔ تمہاری محبت اور خلوص، تمہارے اماں، ابا کی شفقت پاؤں میں زنجیریں ڈالتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ ان محبتوں کے حصار میں زندگی گزار دوں لیکن رابو زندگی یوں تو جامد ہو جائے گی اور یاد ہے ناں سر مجیب کیا کہتے تھے کہ جمود موت ہے تو مائی ڈیئر میں ابھی جینا چاہتی ہوں......'' اس نے بیگ کی زپ بند کی۔

''ہزاروں برس جیو میری پیاری......'' رابعہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔

''یار ہزاروں سال نہیں جینا چاہتی......''

وہ بے اختیار ہنسی تو رابعہ کی مسکراہٹ بھی گہری ہوئی۔ وہ نتاشہ کی بات سمجھ سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے۔ وہ ساری زندگی یہاں اس کے گھر رہ کر اپنی زندگی ضائع نہیں کر سکتی تھی پھر دوسروں کے گھر رہنا آسان نہیں ہوتا...... دل نہ جانے کن، کن احساسات میں گھرا رہتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں دل ایک دم اداس سا ہو گیا تھا۔ عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ نتاشہ کو روک لے۔ حالانکہ نتاشہ کو ان کے گھر رہتے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔

''چھٹیوں میں اِدھر ہی آنا کہیں اپنے ماموں کی طرف نہ چلی جانا......'' اس نے تاکید کی۔

''اور کہاں جانا ہے...... ماموں کے پاس جانا ہوتا تو وہاں سے آتے ہی کیوں...... تمہارے گھر کے علاوہ اور کوئی ٹھکانا کہاں ہے اب ہمارا......'' وہ اداسی سے مسکرائی اور اماں کی طرف دیکھا جو بیڈ پر سر جھکائے نہ جانے کس خیال میں گم تھیں۔

''اماں آپ نے آنٹی کے پاس زیور وغیرہ رکھوا دیا۔''

''ہاں......'' انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو نتاشہ نے دیکھا کہ اُن کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کیا اماں روئی تھیں۔ اس نے سوچا...... اس نے ہمیشہ اماں کو بہت صابر اور شاکر پایا تھا۔

سوائے ابا کی ڈیتھ کے اس نے انہیں کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ امن کا ذکر کرتے اور اسے یاد کرتے ہوئے بھی آخر میں ہمیشہ یہی کہتی تھیں۔ ''میرے اللہ کی مرضی...... اس کی رضا پر راضی ہیں ہم......''

''کیا ہوا ہے اماں...... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی......'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اُن کے پاس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''کچھ نہیں...... ٹھیک ہے طبیعت، بس یوں ہی دل گھبرا رہا ہے، شاید نئی جگہ پر جانے کے خیال سے۔''

ایک گہری سانس لے کر وہ خاموش ہو گئیں۔

"میں بھی جب کہیں سے جاؤں...... یا میرے گھر سے کوئی مہمان جائے تو میرا دل بہت گھبراتا ہے۔ میں بہت اداس ہو جاتی ہوں رونے کو جی چاہتا ہے۔" رابعہ کی آواز بھرا سی گئی۔

"بچھڑنا اور ملنا تو زندگی کا حصہ ہے۔ پہلی بار ہم یونیورسٹی میں ملے تھے۔ اس سے پہلے ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔ پھر دو سال کے ساتھ نے ہمارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا۔ گہرا تعلق بن گیا۔ یاد ہے ناں فاطمہ اور فارحہ کتنا رو رہی تھیں۔ سب ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے اور ملتے رہنے کا وعدہ کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کی شادی میں شامل ہونے کا لیکن میں نے کسی سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ مجھے اندر سے پتا تھا کہ شاید میں کبھی کسی یونیورسٹی فیلو سے دوبارہ نہ مل سکوں...... میرا باپ نہیں تھا، بھائی نہیں تھا، میں تو دوسروں کی محتاج تھی۔ احسانوں کے بوجھ سے دبی' میں کیسے کسی سے کہتی کہ مجھے میری دوستوں سے ملنے جانا ہے۔ پتا ہے رابو، میرے تو تصور میں بھی نہیں تھا کہ ہم کبھی دوبارہ ملیں گے لیکن دیکھو تقدیر مجھے تمہارے در پر لے آئی۔ اور اب یہ ہی تقدیر مجھے کہاں لے کر جا رہی ہے۔" اداس سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔ تب ہی دروازے سے رابعہ کی اماں نے جھانکا۔

"ڈرائیور آ گیا ہے رابی، تمہارے ابا کہہ رہے ہیں آ جاؤ......" جیسا رابعہ نے کہا تھا کہ اس کے ابا انہیں سیالکوٹ تک چھوڑ آئیں گے تو وہ اب انہیں چھوڑنے جا رہے تھے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چادر اچھی طرح اوڑھ کر رابعہ اور اس کی اماں سے مل کر بیگ اٹھایا۔ اماں اب رابعہ اور اس کی اماں سے مل رہی تھیں۔ وہ بیگ اٹھائے باہر نکلی تو برآمدے میں رابعہ کے ابا ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ سے بیگ لے لیا...... رابعہ نے اماں کا چھوٹا بیگ اٹھا رکھا تھا، وہ بھی انہوں نے اس سے لیا تو اسے بابا یاد آ گئے۔ بابا بھی ایسے ہی تھے وہ ساتھ ہوتے تو کبھی انہیں سامان نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ وہ اماں کا ہاتھ پکڑے باہر گاڑی تک آئی تھی۔ رابعہ دروازے میں کھڑی اس وقت تک ہاتھ ہلاتی رہی تھی جب تک گاڑی آگے نہ بڑھ گئی۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ شیشہ بند کیا اور ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں پونچھیں۔

رات انہیں سیالکوٹ میں ہی رابعہ کی پھپو کے گھر رہنا تھا۔ صبح رابعہ کے ابا انہیں گوجرانوالہ کی کوچ میں بٹھا دیتے اور وہاں بسوں کے اڈے پر گاؤں سے کوئی نہ کوئی انہیں لینے آیا ہوا ہوتا...... رابعہ نے کوثر سے رات کو فون پر کہہ دیا تھا کہ یا تو وہ خود آئے بسوں کے اڈے پر یا کسی کو بھیج دے کہ نتاشہ اور اس کی اماں پہلی بار تمہارے گاؤں آ رہی ہیں تو کہاں سے سوزوکیاں ڈھونڈتی رہیں گی۔ اور اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ سیالکوٹ سے روانہ ہونے سے پہلے اسے فون کر دیں تو وہ اول تو خود ہی کسی کے ساتھ آئے گی اگر کسی وجہ سے نہ آ سکی تو بھائی کو بھیج دے گی۔ اس کا یہ چھوٹا بھائی ہی ہمیشہ اسے یونیورسٹی سے لینے آتا تھا تو اس کی فرینڈز اسے پہچانتی تھیں۔ یوں وہ اس طرف سے مطمئن تھی۔ لیکن اماں پتا نہیں کیوں اسے گم صم اور پریشان سی لگ رہی تھیں۔

رابعہ کی پھپو بالکل ویسی ہی تھیں جیسے رابعہ نے بتایا۔ مہربان اور شفیق سی۔ بہت محبت اور خوش دلی سے ملیں۔ ان کے انداز میں اتنی اپنائیت تھی کہ انہیں وہ ذرا بھی اجنبی نہ لگیں۔ ان کے بڑے تینوں بیٹے لاہور میں پڑھتے تھے جبکہ بیٹی جو بھائیوں سے چھوٹی تھی ابھی فرسٹ ائیر میں تھی۔ وہ بھی بہت ملنسار اور خوش اخلاق سی تھی۔ اماں بھی اسے کچھ سکون میں لگیں۔ کھانے پر انہوں نے کافی اہتمام کر رکھا تھا یقیناً رابعہ نے انہیں فون کر دیا ہوگا کہ وہ لوگ آ رہے ہیں۔ بہت خوب صورت گھر تھا ان کا...... رات کو کھانے کے بعد وہ گیسٹ روم میں آ گئیں جہاں ان کے سونے کا انتظام تھا۔ اماں نماز سے فارغ ہو کر سونے کے لیے لیٹیں تو وہ اٹھ کر اُن کے بیڈ پر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور ان

ماہر تعلیم، معروف ادیبہ، شاعرہ اور میاں چنوں، ساہیوال کی معروف شخصیت افتخار شوق صاحبہ کے نوعمر بھانجے محمد یاسر مقبول اور محمد سالار مقبول مدرسہ دار التقویٰ گلشن مہر علی، عبد الحکیم سے حفاظ کرام کے عظیم منصب پر فائز ہوئے ہیں۔
الحمدللہ۔ اللہ پاک بچوں کو نیک و صالح بنائے اور والدین کے لیے بخشش کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اماں آپ اتنی پریشان اور چپ، چپ سی کیوں ہیں مجھے بتائیے..... کیا چیز آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ کیا ہمارا یہاں آنا اور میرا ایک چھوٹے سے گاؤں میں جاب کرنا.....؟''

''نہیں.....'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''پتا نہیں کیوں دل کچھ پریشان سا ہے خود مجھے سمجھ نہیں آ رہی.....'' انہوں نے جیسے بے بسی سے اسے دیکھا۔

''میں آپ کی کیفیت سمجھ رہی ہوں اماں..... آپ کا یوں ماموں کے گھر سے چلے آنا پہلے رابعہ کی طرف اور اب اِدھر..... آپ کو اندر سے یہ چیز پریشان کر رہی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی حل بھی نہیں تھا ہمارے پاس..... کہیں نہ کہیں سے تو ہمیں ابتدا کرنی ہی تھی تو یہاں سے ہی سہی۔'' اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں سوچ رہی ہوں اماں کسی سنڈے کو ہم لاہور بابا کی قبر پر جائیں..... بہت جی چاہ رہا ہے کہ وہاں بابا کی قبر کے پاس بیٹھ کر اُن سے ڈھیر ساری باتیں کروں..... کیا پتا وہ ہمارا انتظار کرتے ہوں..... کوئی بھی تو ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے نہیں جاتا ہوگا.....'' خوب صورت سیاہ آنکھوں میں جیسے اچانک نمی پھیل گئی تھی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

''تمہارے چچا جان اور ان کے بیٹے اگر پاکستان میں ہوئے تو ضرور جاتے ہوں گے۔ دونوں بھائیوں میں بہت محبت تھی تاشی..... یک جان دو قالب تھے۔ پھر جدائیاں پڑ گئیں۔ لیکن تمہارے بابا جس طرح بھائی کے لیے تڑپتے تھے۔ ویسے ہی وہ بھی تڑپتے ہوں گے۔ لیکن زندگی میں بچھڑنے کے بعد پھر ملاقات نصیب میں نہیں تھی۔ آئے تو ہوں گے..... آنا تھا انہیں اور پھر بیٹے نے بتایا ہوگا کہ کیسے آخری لمحوں تک انہوں نے اپنے بھائی کا انتظار کیا..... تو جب، جب پاکستان آتے ہوں گے تمہارے بابا کی قبر پر ضرور جاتے ہوں گے۔''

انہیں جیسے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

''بابا تو زندہ نہیں رہے تھے لیکن ہم تو تھے ناں اماں..... کیا انہیں صرف بابا سے پیار تھا، بابا کے رشتوں سے نہیں..... انہوں نے ہمیں کیوں نہیں ڈھونڈا..... کیوں نہیں ملنے آئے ہم سے.....؟'' نتاشہ نے پہلی بار شکوہ کیا۔

''ڈھونڈا تو ہوگا تاشی..... لیکن شاید ہم ہی کھو گئے تھے۔'' وہ جیسے سامنے خلا میں دیکھ رہی تھیں۔

''سنو تاشی.....'' انہیں یک دم خیال آیا تھا کہ انہیں نتاشہ کو کچھ بتانا تھا کچھ ضروری وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''تمہارے بابا نے کچھ کاغذات دیے تھے مجھے کہ اگر مان واپس آجائے۔ کبھی مل جائے تو یہ کاغذات اس کی امانت ہیں۔ شاید زمین وغیرہ کے ہیں۔ وہ میں نے زیورات کے ساتھ ہی رابعہ کی امی کے پاس رکھوائے ہیں اگر کبھی زندگی میں وہ تمہیں ملے تو وہ اس کے حوالے کر دینا۔'' انہوں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''لیکن میں بھلا مانی کو کیسے پہچانوں گی اماں.....'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''آپ نے مجھے بتایا تھا کہ میں تین ماہ کی تھی جب مان گم ہوا تھا۔''

''ہاں.....'' ان کی آنکھوں میں ملال کے رنگ گہرے ہو گئے تھے۔

''تم تین ماہ کی تھیں اور مانی تقریباً تین سال کا تھا جب ہم گاؤں گئے تھے اور وہ گم ہو گیا۔''

''کیسے گم ہوا تھا اماں.....؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں تاشو، مجھے تو خود آج تک سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیسے کھو گیا۔ میں اسے صحن میں کھیلتا چھوڑ کر کچن میں تمہارے لیے دودھ بنانے گئی تھی۔ تمہارا فیڈر بھی دھونا تھا۔ وہاں ملازم تھے لیکن تمہارے بابا کہتے تھے اپنے بچوں کے کام خود کیا کرو اور خود میری بھی عادت تھی کہ فیڈر دھونا پانی ابال کر رکھنا خود ہی کرتی تھی۔ وہ تمہارے دادا جان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ وہ بہت پیاری باتیں کرتا تھا۔ معصوم سے سوال، دونوں ہاتھ ہلا، ہلا کر..... اور تمہارے دادا جان بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ جب میں فارغ ہو کر باہر آئی تھی تو صحن خالی تھا۔ اس کی فیورٹ گاڑی جسے وہ چلا رہا تھا صحن میں پڑی تھی۔'' لگتا ہے دادا سے بہت دوستی ہو گئی ہے۔ شاید ان کے ساتھ سونے چلا گیا ہو۔'' میں نے سوچا ورنہ تو سوتے میں بھی اس سیل سے چلنے والی کھلونا گاڑی کو اپنے پاس رکھ کر سوتا تھا۔ میں نے گاڑی اٹھائی اور تمہیں دودھ پلا کر سلا کر جب کمرے سے باہر نکلی تو تمہارے دادا جان اپنے کمرے سے باہر نکل کر شاید کہیں جا رہے تھے۔

''مانی کہاں ہے؟'' میں نے ان کے پیچھے دیکھا..... وہ ان کے ساتھ نہیں تھا تو پھر کہاں تھا۔

''مجھے کیا پتا کہاں ہے..... میں اسے یہاں ہی کھیلتا چھوڑ کر چلا گیا تھا'' میں گھبرا گئی تھی۔ ''اِدھر اُدھر دیکھ یہاں ہی ہوگا..... کہاں جانا ہے اس نے۔'' تمہارے دادا جان سے بات کرتے ہوئے میں گھبرا جاتی تھی۔ بہت خوف آتا تھا مجھے ان سے..... ان کے چہرے کی کرختگی، لہجے کی سختی..... آنکھوں کی تپش یا نفرت کہہ لو مجھے سہا دیتی تھی۔ میں ان کی پسندیدہ بہو جو نہیں تھی، تمہارے بابا نے مجھ سے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔

آج پہلی بار وہ اسے بتا رہی تھیں کہ بابا کی اور ان کی شادی پسند کی تھی۔ بابا نے یا انہوں نے کبھی اپنے ماضی کے حوالے سے بات نہیں کی تھی۔ ہاں اپنے آخری دنوں میں بابا نے کچھ رشتوں کے حوالے سے بات کی تھی اس سے..... سو اسے تجسس ہوا اور وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ اماں نے انگلی کی پور سے آنکھوں کی کور پر اٹکا آنسو پونچھا اور ہولے، ہولے بتانے لگیں۔

''میں ان سے مانی کے متعلق کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی، کہنا چاہتی تھی کہ میں تو ان کے پاس اسے چھوڑ کر گئی تھی پھر وہ اسے صحن میں اکیلا چھوڑ کر کیوں چلے گئے..... کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے بتا دیتے لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور..... اور پھر وہ کہیں نہیں ملا..... بہت ڈھونڈا، نہ وہ حویلی میں تھا نہ باہر گاؤں میں

کہیں..... تمہارے بابا اور چاچو پاگلوں کی طرح آدھی رات تک اسے ڈھونڈتے رہے۔ چھوٹا سا گاؤں تھا کسی گاؤں والے نے بھی دیکھا نہیں...... صحن کا دروازہ بند تھا۔ اور وہ اتنا بھاری تھا کہ وہ اسے خود کھول نہیں سکتا تھا۔ رپورٹ بھی درج کروائی۔ اخبار میں اشتہار دیا۔ آخر میں سب نے یہی کہا تھا کہ شاید کسی ملازم نے یا حویلی میں کام سے آنے والی عورت نے دروازہ کھولا ہو اور وہ باہر نکل گیا ہو۔ رجب کا مہینہ تھا۔ شہر سے مانگنے والے فقیروں کے گروپ گاؤں آجاتے تھے اور یوں بھیک مانگتے ہوئے کسی دوسرے گاؤں نکل جاتے۔ وہ باہر نکلا ہو تو شاید کسی بھکاری نے اٹھا لیا ہو...... آس پاس کے جتنے گاؤں تھے سب جگہ پولیس گئی، ان بھکاریوں کے ٹھکانوں پر بھی چھاپا مارا لیکن میرا امان نہیں ملا۔"

آنکھوں میں رکے آنسو بہہ نکلے تھے اس نے ہاتھ بڑھا کر انہیں ساتھ لگا لیا۔ کچھ دیر رونے کے بعد وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کیا۔

"تم کہتی ہو ناں کہ اگر کبھی زندگی میں وہ تمہیں ملا تو تم کیسے پہچانو گی...... خون کی کشش تو ہو گی ہی لیکن اس کی تمہارے بابا سے بہت مشابہت تھی اور بالکل تمہارے بابا کی طرح دائیں آنکھ کے نیچے ایک تل تھا اور ایک تل بائیں طرف ناک پر...... وہ جوان ہو کر یقیناً اپنے بابا کی طرح لگتا ہوگا...... تم اسے پہچان لو گی تاشہ......"

تاشہ نے ان کی طرف دیکھا اسے ان کی آنکھیں بہت روشن، روشن سی لگیں اور چہرے پر بھی ایک انوکھی سی چمک تھی شاید تصور کی آنکھوں سے وہ اسے دیکھ رہی تھیں اس کا دل درد سے بھر گیا۔

پتا نہیں وہ ہے بھی یا نہیں...... اتنا عرصہ گزر گیا کبھی تو کہیں سے کوئی اس کا پتا دیتا۔ اتنا تو اسے پتا تھا کہ بابا اکثر اخبار میں اشتہارات دیتے رہتے تھے، جب بھی انہیں پتا چلتا کہ کہیں سے اغوا شدہ بچے بازیاب ہوئے ہیں تو وہ وہاں ہی پہنچ جاتے، تھانوں کے چکر بھی لگاتے رہتے تھے کہ شاید کہیں سے کوئی خبر مل جائے...... لیکن...... کیا خبر اغوا کرنے والوں نے اسے مار دیا ہو...... اور کیا خبر ہاتھ پیر توڑ کر کہیں بھیک منگوانے کے لیے بٹھا دیا ہو...... اس نے سوچا اب وہ ہر بھکاری کو غور سے دیکھے گی۔ کیا خبر کوئی ان میں مانی ہو......

"اور مجھے یقین ہے کہ ایک روز وہ ہمیں ملے گا ضرور۔"

"پتا نہیں اماں وہ اب اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں......" اماں کے یقین پر اس کے دل میں جیسے بھالے سے چبھتے تھے۔

"نہیں...... نہیں ایسا مت کہو تاشی......" انہوں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"وہ ہے...... وہ آئے گا...... تمہارے بابا نے مجھ سے کہا تھا۔ پتا ہے تاشی مرے ہوئے پر ہولے، ہولے صبر آجاتا ہے ان کی جدائی پر کھل کر رو لیا جاتا ہے لیکن جو زندہ بچھڑ جائیں ان کا ہجر آخری سانسوں تک تڑپاتا ہے۔ ہم تمہارے سامنے خود کو سنبھالے رکھتے تھے لیکن رات کو جب اپنے کمرے میں جاتے تو تڑپ، تڑپ کر روتے کہ پتا نہیں وہ کہاں ہوگا...... اس نے کچھ کھایا پیا بھی ہوگا یا نہیں...... اسے ٹھیک سے نیند بھی آتی ہوگی یا نہیں...... روتے، روتے ہم تھک جاتے تو خود ہی اپنے آنسو پونچھ لیتے۔ تمہارے بابا کہتے تھے۔ اسے رو مت صبا...... دعا کرو اس کے لیے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو زندہ ہو...... محفوظ ہو، اچھے ہاتھوں میں ہو...... اور ہم آدھی رات کو جا نماز بچھا کر نفل پڑھنے لگ جاتے...... اپنے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگتے کہ ہمارا بچہ ہمیں مل جائے۔"

تاشہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش تسلی دی۔

"لیکن دعاؤں کے باوجود دل کو سکون نہیں ملتا تھا۔ ہماری راتیں یوں ہی بے چینی سے کٹتی تھیں۔ پھر تمہارے بابا بیمار ہو گئے اور جس روز ان کی بیماری کی تشخیص ہوئی تو وہ رات بہت مشکل تھی اس رات ہم دونوں ایک پل، کے لیے بھی سو نہیں پائے

تھے...... اس روز تمہارے بابا نے ماں کو بہت یاد کیا۔'' وہ روتے ہوئے بتارہی تھیں۔

''وہ ہوتا آج تو میں اطمینان سے اپنے آخری سفر کی تیاریاں کرتا صبا...... مجھے اپنی موت کا دکھ نہیں ہے۔ہم سب وعدہ کرکے آئے ہیں۔ ہمیں جانا ہی ہے۔ مجھے تم دونوں کی فکر ہے تم دونوں اکیلی عورتیں کیسے اس ظالم دنیا میں سروائیو (survive) کروگی......وہ ہوتا تو مجھے تمہاری فکر نہ ہوتی......'' وہ سال بھر یوں ہی بے چین رہے یوں ہی ہر روز اسے یاد کرتے لیکن اپنی موت سے چند ماہ پہلے وہ پُرسکون لگنے لگے تھے انہوں نے ماں کو یاد کرنا اور یہ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ کاش وہ ہوتا...... میں نے اس بیماری کے مریضوں کو پندرہ، پندرہ سولہ، سولہ سال جیتے دیکھا ہے لیکن تمہارے بابا تو یہ تشخیص کہ کینسر ہے ہونے کے بعد بمشکل سات سال ہی جی پائے...... پتا ہے تاشی انہوں نے کبھی اپنا خیال نہیں رکھا تھا کبھی چھوٹی، موٹی تکلیف کی پروا نہیں کی تب ہی پتا نہیں چلا اور جب تکلیف حد سے بڑھ گئی تو پتا چلا اب آخری اسٹیج ہے۔'' انہوں نے ہتھیلیوں سے بے اختیار بہہ جانے والے آنسوؤں کو پونچھا۔اور کچھ دیر یوں ہی خاموشی سے بیٹھی رہیں۔

''اماں......اب آپ آرام کریں باقی باتیں پھر کسی روز کرلیں گے۔'' اس نے ماں کے تھکے، تھکے اور نڈھال چہرے پر نظر ڈالی تھی۔ ورنہ اس کا تو جی چاہ رہا تھا کہ آج وہ سب کچھ جان لے جس کا ابھی تک اسے علم نہیں تھا اس کے اندر بہت سارے سوال اٹھ رہے تھے لیکن اسے ماں کا بھی خیال تھا۔

''ہاں کرلوں گی آرام...... میں تمہیں یان کے متعلق بتارہی تھی ناں، یہ اس روز کی بات تھی جب میری طبیعت خراب تھی اور وہ اکیلے ہی چیک اپ کے لیے چلے گئے تھے۔ واپس آئے تو میں نے بے چینی سے پوچھا تھا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا...... کچھ بہتری آئی؟''

''نہیں......'' وہ بہت پُرسکون تھے۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ سوراخ پھر سے بن گیا ہے اور بڑا ہوتا جارہا ہے۔'' انہیں جگر کا کینسر تھا۔اور ایک سال پہلے ڈاکٹر نے ان کا آپریشن کرکے سوراخ فل کردیا تھا۔سوراخ بھرنے کے لیے جسم کے ہی کسی حصے سے ایک پیس لیا گیا تھا۔''

میں حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''کیا پھر آپریشن ہوگا......'' میں نے پوچھا تھا تو وہ اسی اطمینان سے بولے تھے۔

''نہیں اب گنجائش نہیں ہے آپریشن کی۔''

''تو اب کیا ہوگا......؟''

''چھوڑو یار اس آپریشن کو اور میری بات دھیان سے سنو۔ ہمارا امن زندہ ہے اور اچھے ہاتھوں میں ہے بہت جلد وہ ہم سے ملنے آئے گا......'' وہ اسے امن کہتے تھے۔ جبکہ صبا کبھی ماں کہہ کر بلاتی تھیں اور کبھی مانی......

''کیسے؟ کس نے بتایا آپ کو......کہاں ہے وہ......چلیں اس سے ملنے چلیں آپ اس کو ساتھ کیوں نہیں لے کر آئے......'' مجھ پر ہیجانی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ لیکن وہ اسی تحمل سے کہہ رہے تھے۔

''آجائے گا صبا جلدی آجائے گا ابھی نہیں آسکتا' اللہ نے ہماری دعائیں سن لیں، ہمیں شکرانے کے نفل ادا کرنے چاہئیں...... چلو اٹھو...... کچھ دنوں بعد مجھے لگنے لگا جیسے مسلسل ماں کے متعلق سوچتے، سوچتے انہوں نے خود ہی سوچ لیا تھا کہ وہ زندہ ہے......وہ آجائے گا لیکن وہ مجھے یقین دلاتے رہتے......لیکن وہ نہیں آیا تاشو اور وہ چلے گئے اسے دیکھنے کی حسرت لیے وہ چلے گئے لیکن جاتے، جاتے میرے پلو سے یقین کی ڈور باندھ گئے۔''

وہ پھر بلک، بلک کر رونے لگیں۔ تاشہ نے ایک بار پھر انہیں گلے سے لگالیا۔

''بس کریں اماں کتنا روئیں گی آج......'' وہ انہیں ساتھ لگائے ہولے، ہولے تھپکنے لگی۔

''اگر اللہ نے چاہا تو ایک روز امن آجائے گا اور اگر اللہ نے نہ چاہا تو آپ نے تو ہمیشہ اللہ کی رضا پر سر جھکالیا ہے......اور مجھے بھی ہمیشہ اللہ کی رضا پر راضی ہونے کی تاکید کی ہے۔''

"ہاں جو اللہ کی مرضی......" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"پر پتا نہیں کیوں آج دل اتنا بے چین ہو رہا ہے۔ پتا ہے تاشو......" انہوں نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بابا کے خاندان نے مجھے قبول نہیں کیا تھا۔ بس ایک بار تمہارے بابا مجھے وہاں لے کر گئے تھے ان کا خیال تھا بچوں کو دیکھ کر تمہارے دادا جان کا دل نرم ہو جائے گا......ان کا دل تو پتا نہیں نرم ہوا تھا یا نہیں لیکن ہم وہاں اپنی قیمتی متاع لٹا کر آئے تو پھر کبھی نہیں گئے۔ انہوں نے کبھی بتایا تو نہیں لیکن میرا خیال تھا کہ شاید تمہارے بابا کا کچھ عرصے تک اپنے بھائیوں سے رابطہ رہا......وہ ماں کے متعلق پوچھتے رہتے تھے ان سے...... پھر یہ رابطہ ٹوٹ گیا۔ کیوں، کیسے یہ مجھے نہیں پتا......اور پھر اب کتنے سالوں بعد اپنی وفات سے صرف تین ماہ پہلے انہوں نے اپنے بھائیوں سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ مہذب سا پیارا سا لڑکا جو تمہارے سامنے ایک بار اسپتال میں آیا تھا یاد ہے ناں تمہیں...... وہ تمہارے چاچو کا بیٹا تھا۔ آخری دنوں میں وہ کئی بار آیا تھا۔ تمہارے بابا سے ملنے اور وہ بہت خوش ہوتے تھے اس سے مل کر...... اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے بہت مدد کی تھی اس نے۔ جب تمہارے بابا کا انتقال ہوا تو وہ ہی تھا ان کے پاس...... میں تو بس ذرا سی دیر کے لیے باہر گئی تھی وارڈ میں ایک سے زیادہ تیمار دار کو نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ شام تک وہ انہیں کمرے میں منتقل کروا دے گا لیکن شام سے پہلے ہی......" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"وہ اتنا اچھا تھا اماں تو پھر بابا کے بعد اس نے ہماری خبر گیری کیوں نہیں کی...... کبھی ملنے نہیں آیا کبھی آ کر پوچھا نہیں کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے۔" یہ وہ سوال تھا جو سیکڑوں بار اس نے خود سے کیا تھا...... اماں کو علم نہیں تھا کہ بابا نے اسے اپنے بھتیجے کے متعلق بتایا تھا۔ بلکہ تعارف بھی کروایا تھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔

"مجھے اب تم لوگوں کی فکر نہیں ہے...... میرے بعد تمہارے چاچو اور ان کے بچے ہیں تمہارا خیال رکھنے کے لیے۔" اور انہوں نے تو اس سے اور بھی بہت کچھ باتیں کی تھیں جو آج تک اس نے اماں سے شیئر نہیں کی تھیں، کیا فائدہ لاحاصل امیدیں پالنے کا۔

"تمہارے بابا کو اسپتال سے آخری منزل تک پہنچانے کے سارے انتظام تو اس نے ہی کیے تھے۔ میرا تو کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا سوائے بھائی صاحب کے اور وہ بھی دوسرے دن پہنچے تھے۔ وہ مسلسل چار دن آتا رہا۔ پھر اس نے بتایا تھا اس کا کوئی پیپر ہے۔ دو تین دن نہیں آ سکے گا......اور ان ہی دو تین دنوں میں مالک مکان نے گھر خالی کروا لیا اور بھائی صاحب ہمیں ساتھ لے آئے۔"

"لیکن آپ صوفی صاحب کو ماموں کے گھر کا پتا تو دے آئی تھیں ناں کہ اگر کوئی آپ کا پوچھے تو ماموں کے گھر کا پتا دے دیں۔ آپ نے تو صوفی صاحب کو پیغام بھی دیا تھا ان کے لیے۔"

اسے اپنے اس چچا زاد سے بہت سارے شکوے تھے جس سے وہ زندگی میں صرف ایک بار ہی ملی تھی اور بابا نے اس کے متعلق اس سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ وہ کتنے پُر امید تھے، کتنا یقین تھا انہیں کہ......

اماں کے پاس شاید اس کے سوال کا جواب نہ تھا اس لیے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں کچن سے پانی کی بوتل لے آؤں اور تم بھی سو جاؤ......اب صبح جلدی ہی نکلیں گے۔ رابی کے ابو کہہ رہے تھے ناشتے کے فوراً بعد وہ ہمیں کوچ پر بٹھا دیں گے کہ خود انہیں واپس جانا ہے۔"

اور وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ آنکھیں جل رہی تھیں [illegible] لیکن بہت دیر تک اسے نیند نہیں آئی تھی [illegible]۔ نانا، نانی کا انتقال اس کے ہوش میں ہی ہوا تھا۔ جب نانا فوت ہوئے تو وہ چھ سال کی تھی اور دو سال بعد نانی کا انتقال ہوا تھا۔ اسے ان کا وہ چھوٹا سا لیکن پیارا سا گھر اب بھی یاد تھا۔ پھر بابا کے علاج کے لیے اماں نے وہ گھر فروخت کر دیا اور وہ لوگ کرائے

کے گھر میں رہنے لگے تھے۔ نانا کی وفات کے بعد نانی اکیلی تھیں تو وہ اُن کے پاس آ گئے تھے۔ وہ دس سال کی تھی تب جب پہلی بار بابا کی بیماری کا پتا چلا تھا۔ اور سات سال بابا بیمار رہے تھے۔ اور یہ سات سال کتنے مشکل تھے۔ اماں کا بہت سارا زیور بک گیا تھا۔ بیماری کے آخری دو سالوں میں تو بابا کی جاب بھی ختم ہو گئی تھی کہ وہ اسے جاری نہیں رکھ سکتے تھے اتنی تکلیف ہوتی تھی انہیں...... جاب اچھی تھی ان کی، بہت اچھا گزارہ ہوتا تھا۔ ٹھیک ٹھاک بچت ہو جاتی تھی انہوں نے ایک پلاٹ کی فائل بھی لے لی تھی لیکن ابھی دو تین اقساط ہی دی تھیں کہ اس بیماری نے سب کچھ ختم کر دیا...... سب خواب بکھر گئے۔ انہوں نے وہ فائل کسی دوست کو دے دی تھی۔ اور اس نے انہیں وہ رقم ادا کر دی تھی جو وہ دے چکے تھے۔ جب قرعہ اندازی میں ان کا نام نکلا تھا سب دوستوں نے جنہوں نے درخواستیں دے رکھی تھیں کتنا رشک کیا تھا ان پر کہ وہ خوش قسمت ہیں کہ اتنے سارے دوستوں میں سے صرف ان کا نام آیا۔

لیکن آنے والے لمحوں کی کسی کو کیا خبر ہوتی ہے کہ کب کیا ہو جائے۔ سارے خواب، ادھورے رہ جائیں...... وہ تو صرف سترہ سال کی تھی جب بابا کا ساتھ چھوٹ گیا۔ کتنا دل چاہتا تھا اس کا کہ وہ ایک لمحہ بھی بابا کو تنہا نہ چھوڑے۔ لیکن جب، جب وہ اسپتال جاتے اماں اسے وہاں نہ رہنے دیتیں۔ بس ملاقات کے وقت تھوڑی دیر کے لیے جاتی اور پھر اماں اسے گھر بھیج دیتی تھیں جب آخری پندرہ دن وہ مسلسل اسپتال میں رہے تھے تو اس نے کتنی ضد کی تھی اماں سے کہ وہ کچھ دن گھر آرام کر لیں رات کو...... یہاں وارڈ میں کتنی بے آرام ہوتی ہوں گی لیکن انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔

"یہ وارڈ ہے تاشی یہاں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں۔" وہ ڈرتی تھیں پتا نہیں کیوں...... کہتی تھیں وہ خوب صورت ہے کم عمر ہے نا سمجھ ہے...... اور دنیا بہت ظالم ہے۔ خود جب وہ اسپتال میں ہوتیں تو صوفی صاحب کی بیوہ بہن کو اس کے پاس چھوڑ جاتی تھیں۔

صوفی صاحب کا گھر...... بالکل ان کے گھر کے سامنے تھا۔ گھر کے ساتھ ہی ان کی دکان تھی۔ اور محلے میں یہ واحد گھرانا تھا جس سے اماں کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ صوفی صاحب کی بیگم بھی ان کی طرح ہی شفیق اور مہربان سی تھیں۔ کاش اسے علم ہوتا کہ بابا اسے یوں چھوڑ کر چلے جائیں گے تو وہ ضد کر کے وہاں ہی بابا کے بیڈ کے پاس بیٹھی انہیں دیکھتی رہتی۔ آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے...... اس نے کروٹ بدل کر دیکھا...... اماں آنکھیں بند کیے بیڈ پر لیٹی تھیں۔ شاید انہیں بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ ماضی کے دکھ، غم اور تکلیفیں شاید کبھی آدمی کو چین کی نیند نہیں سونے دیتیں۔ اس کا دل چاہا اماں سے پوچھے کہ اتنے دن وہ بابا کے پاس اسپتال آتا رہا انہوں نے اس کا اتا پتا نہیں پوچھا اور کیا انہیں بابا کے بہن، بھائیوں، اماں، ابا کسی کے متعلق کچھ نہیں معلوم...... وہ ایک بار گاؤں گئی تو تھیں اپنی سسرال...... انہیں پتا تو ہوگا کہ کون سا گاؤں تھا...... لیکن اماں نے اب دیوار کی طرف کروٹ بدل لی تھی۔ وہ تو چاہنے کے باوجود بابا سے بھی کبھی نہ پوچھ پائی کہ وہ پہلے ہی امن کے اغوا کی وجہ سے دکھ اور تکلیف میں رہتے تھے بس ایک بار جب وہ پانچویں جماعت میں تھی تو اپنے دادا، دادی کے متعلق پوچھا تھا کہ اسے نانا، نانی کی کمی بے حد محسوس ہوتی تھی۔ تو انہوں نے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ تمہارے دادا اور دادی اس دنیا میں نہیں ہیں...... اور پھر وہ کتنے ہی دن افسردہ سے رہے تھے۔ اس نے کئی بار انہیں آنسو پونچھتے دیکھا تھا...... اور سوچا تھا کہ اب وہ کبھی ان سے دادا، دادی اور ان کے رشتے داروں کے متعلق نہیں پوچھے گی اور اس نے پھر کبھی نہیں پوچھا تھا کہ لیکن پھر بابا کے پاس وہ آ گیا۔ اس کا چچا زاد بھائی...... بابا اپنی تکلیف کے باوجود اتنے خوش دکھتے تھے جتنا اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...... اور اگر وہ وہاں ہی رہتے

تو......شاید وہ آتا اماں کے پاس......اس نے اماں سے کہا تو تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ کاش ماموں، اماں کی بات مان کر ان کا زیور بیچ کر مکان کا کرایہ ادا کر دیتے اور انہیں ساتھ لے کر نہ آتے تو......لیکن جب اماں نے انہیں زیور دیا کہ فروخت کر کے اب تک کا سارا کرایہ دے دیں تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔

''ہرگز نہیں، یہ زیور سنبھال کر رکھو...... میں ہوں ناں تمہارا واحد وارث، تم سامان باندھو...... میں تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا......کرایے کی بات نہ بھی ہوتی تب بھی نہیں...... مجھے اس مالک مکان کی نیت صحیح نہیں لگتی......تم اب میری ذمّے داری ہو اور میں مرتے دم تک یہ ذمّے داری نبھاؤں گا۔''

اور انہوں نے ذمّے داری نبھائی تھی۔ بہت اچھی طرح سے ......بس وہ بھا...اور ماموں صحیح کہتے تھے کہ مالک مکان کی نیت صحیح نہیں تھی۔ گو اماں نے کبھی اس سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ سمجھتی تھی اس نے بابا کے بعد اماں سے صوفی صاحب کی بیگم کو کہتے سنا تھا۔

''یہ خان صاحب تو جیسے میر بھائی کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے تب ہی تو کرایے میں چھوٹ دے رہے تھے کہ کوئی بات نہیں بعد میں آجائے گا جب......شاہ میر صاحب صحت مند ہو جائیں گے ورنہ یہ تو ایک دن اوپر نیچے ہو جائے تو کرایے دار کا ذرا سا بھی لحاظ کیے بغیر سامان اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ کل گلی میں مجھے روک لیا کہ تم کو ان کی طرف سے شادی کا پیغام دوں...... مکان تمہارے نام کر دیں گے، میں نے تو خوب سنائیں......اب دیکھو عدت کے بعد تم سے ڈائریکٹ بات کریں گے، ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جوان بچے اور بیوی گھر میں موجود ہیں اور...... ......اور شاید اسی لیے اماں نے ماموں کے ساتھ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا ورنہ وہ تو اتنی خوددار تھیں کہ بابا کے علاج کے لیے بھی کسی سے مدد نہیں مانگی تھی۔

اماں کے ہلکے، ہلکے خراٹوں کی آواز آئی تو اس نے ایک بار پھر رخ موڑ کر انہیں دیکھا۔

''اور وہ بابا کا بھتیجا......؟'' اس کے ذہن کی رو پھر بھٹکی تھی۔'' اگر زندگی میں کبھی ملا تو ضرور پوچھوں گی کہ وہ جو بابا کے سامنے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا......''میری کوئی بہن نہیں ہے آج سے...... یہ میری بہن ہے، میری ذمّے داری...... میں ہمیشہ سگی بہنوں کی طرح اس کا خیال رکھوں گا......وہ سب جھوٹ تھا کیا؟'' اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور پھر وہ بھی یوں ہی سوچتے، سوچتے سو گئی تھی۔

صبح ناشتے کے بعد رابعہ کے ابو نے انہیں گوجرانوالہ جانے والی بس پر بٹھا دیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ میں نے پی سی او سے گاؤں فون بھی کر دیا ہے۔ تمہاری دوست آجائے گی تمہیں لینے...... ہوسکتا ہے اسے کچھ دیر ہو جائے تو آپ لوگ وہاں ہی انتظار کرنا......اور وہاں پہنچ کر گھر رابعہ کو فون ضرور کر دینا۔'' وہ بس کے چلنے تک وہاں ہی کھڑے رہے تھے۔ بہت وضعدار لوگ تھے۔ رابعہ کی پھپو نے بھی انہیں سوٹ گفٹ کیے تھے کہ وہ پہلی بار ان کے گھر آئے تھے۔ رابعہ تو اس کی دوست تھی ہی لیکن وہ ان کے خاندان سے بھی بہت متاثر ہوئی تھی۔ غیر ہو کر کتنا ساتھ دے رہے تھے وہ......اور ایک وہ تھا اس کا کزن...... چچا کا بیٹا وعدہ کر کے بھی ان کی خیر خبر نہیں لی......وہ ایک بار پھر اس کے متعلق سوچنے لگی کہ اپنی بات چیت اپنے رکھ رکھاؤ سے وہ ایسا لگتا تو نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ جھوٹ ہوگا......بس چلنے کے کچھ دیر بعد ہی اماں سیٹ سے سر لگا کر سو گئی تھیں۔ شاید رات ٹھیک سے سو نہیں سکی ہوں گی......لیکن اسے بس یا گاڑی میں نیند نہیں آتی تھی پھر بھی اس نے آنکھیں بند کر کے کھڑکی سے سر لگا لیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ بس کو روانہ ہوئے کتنی دیر ہو گئی تھی وہ تو بس آنکھیں موندے گزرے دنوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ سارے شب و روز جو گزر چکے تھے آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے کہ اچانک زوردار دھماکا ہوا تھا اور ساتھ ہی لوگوں کی چیخ و پکار ان کی سیٹ دروازے کے ساتھ ہی تھی۔ وہ اچھل کر پہلے دروازے میں کھڑے کنڈیکٹر

کے پاس گری بس کو پھر جھٹکا لگا تھا اور وہ اچھل کر سڑک کے کنارے موجود جھاڑیوں میں جا گری۔

''اماں......'' اس کے لبوں سے نکلا تھا......اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر چکرا کر گر گئی تھی۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک کمرے میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ رابعہ کے گھر کا کمرا تو نہیں تھا...... پھر...... پھر وہ کہاں تھی...... اور یہاں کیسے آئی...... اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا......آنے والا اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی تکیے کے پاس رکھا اپنا دوپٹا اٹھا کر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا۔

''آپ کون ہیں اور میں کہاں ہوں اور آپ اس طرح بغیر دستک دیے کیوں آئے ہیں اندر......''

آنے والے کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آ گیا ہے......

اب آپ کے سوالوں کے جواب تو میں کون ہوں تو میرا نام...... جو بھی ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں آپ کے لیے اجنبی ہوں...... اور آپ کہاں ہیں تو آپ میرے گھر میں ہیں...... یہاں سے کچھ دور سڑک پر بس کو حادثہ پیش آیا تھا۔ بس الٹ گئی تھی وہاں یہ ہی کہا جا رہا تھا کہ ڈرائیور کسی دوسری بس کے ساتھ ریس لگا رہا تھا جو اسے اوور ٹیک کر گئی تھی...... بس کی بریکیں بھی فیل ہو گئی تھیں اور وہ مخالف سمت سے آنے والے ایک ٹرالے سے ٹکرا گئی تھی۔ میں اپنے گھر جا رہا تھا۔ حادثے کی وجہ سے رکا......میرے علاوہ اور بھی کئی لوگ اپنی، اپنی گاڑیاں روک کر زخمیوں کی مدد کر رہے تھے اور سیٹوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کو نکالنے کی کوشش کر رہے تھے...... جب سب زخمیوں اور مرنے والوں کو اسپتال پہنچا دیا گیا تو میں بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا کہ اچانک مجھے جھاڑیوں میں سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی تو میں جھاڑیوں کی طرف بڑھا جہاں آپ تقریباً بے ہوش پڑی تھیں اور میں آپ کو...... اٹھا کر گھر لے آیا کہ اب نہ تو وہاں کوئی ایمبولینس تھی نہ کوئی زخمی......اور آپ بظاہر زخمی بھی نہیں لگ رہی تھیں۔ کنپٹی کے پاس ذرا سا خم تھا......میں نے سوچا تھا کہ گھر میں ہی آپ کو ابتدائی طبی امداد دے کر جہاں آپ کو جانا ہوا وہاں پہنچا دوں گا لیکن......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''اماں......میری اماں......'' وہ اب کھڑی ہو گئی تھی اسے یاد آ گیا تھا کہ بس کو حادثہ پیش آیا تھا اور......

''پلیز مجھے جانا ہے...... مجھے اس اسپتال میں لے چلیں جہاں زخمیوں کو لے جایا گیا ہے۔''

''اس حادثے میں تیرہ اموات ہوئیں اور تیس کے قریب لوگ شدید زخمی ہوئے۔ باقیوں کو معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ مرنے والوں میں چھ عورتیں، چار مرد اور تین بچے تھے۔ وہ ابھی تک دروازے کے پاس کھڑا تھا۔

''نہیں......میری اماں کو کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''آپ کے ساتھ آپ کی والدہ کے علاوہ اور کون تھا؟''

''کوئی نہیں......بس میں اور اماں تھے۔ پلیز، مجھے لے جائیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''میری اماں کو کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں، وہ وہاں ہی اسپتال میں ہوں گی اور مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ کیا خبر وہ بہت زخمی ہوں۔ انہیں میری ضرورت ہو۔''

''آپ کو پتا ہے کہ آپ کتنے دن بے ہوش رہی ہیں۔ آپ کے سر پر چوٹ لگی تھی اور آپ کو ہوش نہیں آ رہا تھا۔''

اس نے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا لی تھی۔

''مقامی ڈاکٹر نے گھر آ کر آپ کو چیک کیا، اس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا تو میں آپ کو لاہور لے گیا۔ وہاں بہترین نیورو سرجن ہی اس طویل بے ہوشی کی وجہ بتا سکتے تھے۔ پھر وہاں چار دن بعد آپ کو ہوش آ گیا لیکن مکمل ہوش میں نہیں آئی تھیں۔ اگلے دو دن وقفے، وقفے سے آپ غنودگی میں چلی جاتی تھیں۔ ہوش آتا تو

اپنی اماں کو بلاتی تھیں۔ ساتویں دن ڈاکٹروں نے مجھے آپ کو گھر لے جانے کی اجازت دی اور کہا کہ اب یہ غنودگی دواؤں کی وجہ سے ہے۔ جب تک آپ خود بیدار نہ ہوں آپ کو نہ جگایا جائے۔" وہ دروازے سے ٹیک لگائے سینے پر ہاتھ باندھے نہایت اطمینان سے باتیں کر رہا تھا اور وہ متوحش سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کل شام کو ہم لاہور سے آئے تھے۔ دواؤں کے زیرِ اثر آپ ساری رات سکون سے سوتی رہیں اور اب دن کے گیارہ بجے بیدار ہوئی ہیں۔"

"نہیں۔" اس کے لبوں سے نکلا۔ سر میں دھمک ہو رہی تھی اور آنکھوں کے آگے ستارے ناچ رہے تھے۔

"نہیں۔" اس کے لبوں سے پھر نکلا۔

"ایسا ہی ہے۔ آج سے آٹھ دن پہلے آپ کی بس کو حادثہ پیش آیا تھا۔" وہ اسی طرح پُرسکون سا کھڑا گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے جانا ہے۔ مجھے اماں کے پاس جانا ہے۔ وہ اسپتال میں ہوں گی، وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔" بے ربط سا بولتے ہوئے بے چین سا ہو کر اس نے قدم اٹھایا لیکن سر چکرا رہا تھا۔ اسے لگا جیسے زمین اس کے قدموں کے نیچے سے نکل گئی ہے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا اور اسے گرنے سے پہلے تھام لیا اور سہارا دیتا ہوا بیڈ تک لایا۔

"ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ سر پر شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے ابھی کچھ دن آپ کو چکر آئیں گے اور متلی ہوگی۔ دواؤں کے استعمال سے ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ شکر ہے کہ چوٹ کی وجہ سے کوئی سیریس مسئلہ نہیں پیدا ہوا۔ آپ مجھے اپنی والدہ کا نام بتائیں اور اپنا بھی، میں اسپتال جا کر ان کے متعلق پتا کرتا ہوں، گوجرانوالہ نزدیک ہونے کی وجہ سے زخمیوں کو گوجرانوالہ کے اسپتال میں لے جایا گیا تھا۔ اگر آپ کی والدہ زخمی ہیں اور وہاں موجود ہیں تو میں انہیں ساتھ لے آؤں گا۔"

اس نے ممنون نظروں سے اس اجنبی کو دیکھا اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں پھر بہہ نکلی تھیں۔ سر چکرا رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے سر میں دھماکے ہو رہے ہیں۔

"میں...... میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

"ابھی آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ آپ چل سکیں۔ آپ آرام کریں، میں پتا کر کے آتا ہوں۔"

وہ شاید صحیح کہہ رہا تھا۔ اس وقت یوں مسلسل چکراتے سر کے ساتھ اسے ایک قدم اٹھانا بھی محال تھا۔ اس نے بے بسی سے اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اس کی نظریں گود میں رکھے اپنے ہاتھوں پر تھیں۔

"پلیز، آپ روئیں نہیں، مجھے تکلیف ہو رہی ہے آپ کے رونے سے۔ میں ابھی جا کر آپ کی والدہ کے متعلق معلوم کرتا ہوں۔ پلیز، اب آپ لیٹ جائیں۔ ملازم ابھی آپ کے کھانے کے لیے کچھ لاتا ہے۔ کھا کر یہ میڈیسن لے لیجیے گا۔"

اس نے ٹیبل پر پڑے شاپر میں سے کچھ ٹیبلٹس نکال کر ٹیبل پر رکھیں اور اسے بتانے لگا کہ ان میں سے کون سی ٹیبلٹ اور کیپسول اس نے اس وقت لینی ہے۔

"اگر سر میں زیادہ درد اور تکلیف ہو تو خیر دین کو بتا دیجیے گا۔ یہ انجکشن ہیں، وہ آپ کو لگا دے گا لیکن اگر تکلیف قابلِ برداشت ہو تو پھر انجکشن نہیں لگوانا۔ ایک جز وقتی ملازمہ ہے ماسی وزیراں، کچن میں کام کر رہی ہے۔ وہ شام کو جاتی ہے، کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس سے کہیے گا۔ شام سے پہلے ہی میں آ جاؤں گا۔ خیر دین بہت بھروسے کا ملازم ہے۔"

"اماں مل جائیں گی ناں؟" اس نے جیسے اس کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔

"ان شاء اللہ! آپ دعا کریں۔"

وہ اسے تسلی دیتا ہوا چلا گیا اور ایک ادھیڑ عمر عورت جو غالباً ماسی وزیراں تھی، ٹرے میں اس کے لیے ناشتا لائی تھی۔ ڈبل روٹی کے سلائس، آملیٹ اور دودھ ایک باؤل میں (پورج) دلیا تھا۔ اس نے وہ ہی تھوڑا سا لیا اور دوا کھا کر لیٹ گئی کہ بے حد چکر آ رہے تھے۔

"یہ کیا ہو گیا... یا اللہ میری اماں کو کچھ نہ ہو، وہ

اس مہربان اجنبی کو مل جائیں اور بس میں اور اماں فوراً ہی یہاں سے واپس چلے جائیں گے، میں رابعہ سے کہوں گی۔ میں اتنی دور جاب نہیں کروں گی۔ وہ اپنے شہر میں ہی کوئی جاب ڈھونڈ دے اور وہاں ہی ہم کوئی چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیں گے۔'' سوچتے، سوچتے وہ سوگئی۔ شاید ان دواؤں میں کوئی نیند کی دوا بھی ہوگی۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر سوئی تھی، جب آنکھ کھلی تو گھبرا کر اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی تھی۔ کمرے کا دروازہ ٹی وی لاؤنج میں کھلتا تھا۔ ٹی وی کی آواز بہت آہستہ تھی اور وہ ایک طرف صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

''آپ کب آئے اور اماں...... اماں کہاں ہیں، کیا وہ نہیں ملیں؟''

بہت سخت چکر آیا تھا۔ سر تھام کر وہ نزدیکی صوفے پر بیٹھ گئی اور وہ بھی اٹھتے، اٹھتے پھر بیٹھ گیا اور اب اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''میری اماں؟'' اس نے اس کا سوال نظرانداز کردیا۔

''میں نے وہاں سب سے پتا کیا۔ صبا نام کی کوئی خاتون زخمی ہونے والی خواتین میں نہیں تھیں۔ زیادہ تر زخمیوں کو ان کے عزیز واقارب آ کر لے گئے، ابھی چند ایک مریض وہاں ہی ایڈمٹ تھے۔ سب مرنے والوں کو بھی ان کے لواحقین لے گئے سوائے ایک عورت کے جسے لینے کوئی نہیں آیا تو اسے لاوارث قرار دے کر دفن کردیا گیا۔ کچھ سیریس زخمیوں کو لاہور بھیجا گیا ہے لیکن میں نے پتا کیا ہے، ان میں کوئی عورت نہیں تھی۔''

وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی پھر وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''ہوسکتا ہے آپ کی والدہ ان لوگوں میں شامل ہوں جو معمولی زخمی ہوں تو وہ بھی اپنے گھر واپس چلی گئی ہوں۔'' اس نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''نہیں، میری اماں میرے بغیر گھر نہیں جاسکتیں...... کبھی نہیں۔ وہ وہاں ہی بیٹھی ہوں گی۔ اسپتال میں کہیں میرا انتظار کرتی ہوں گی یا پھر وہاں ہی سڑک پر جہاں حادثہ ہوا۔ وہ مجھے ڈھونڈتی ہوں گی، میں جانتی ہوں اپنی اماں کو۔ مجھے جانا ہے... مجھے لے چلیں وہاں۔ میں ڈھونڈ لوں گی خود انہیں۔ میں جانتی ہوں اپنی اماں کو۔'' وہ ہسٹریک ہورہی تھی۔

''میں جانتی ہوں ناں اپنی اماں کو آپ نہیں...... وہ تو مجھے اسپتال میں بابا کے پاس اکیلے چھوڑ کر نہیں جاتی تھیں۔ اب کیسے اکیلا چھوڑ کر جاسکتی ہیں...... نہیں...... میں ابھی جاؤں گی انہیں ڈھونڈنے۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی لیکن وہ یوں ہی اطمینان سے بیٹھا اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر اسی اطمینان سے بولا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ وہ لاوارث عورت آپ کی والدہ تھیں؟''

''نہیں۔'' پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ چیخی اور پھر چیختی چلی گئی۔

''میری اماں نہیں مرسکتیں...... کبھی نہیں۔''

اب وہ بلند آواز میں رو رہی تھی...... روتے، روتے وہ کارپٹ پر بیٹھ گئی...... کبھی منہ پر ہاتھ رکھتی اپنی آواز روکنے کے لیے، کبھی آنکھوں کو بری طرح رگڑتی لیکن اسے خود پر اختیار نہیں تھا اور وہ روتی رہی۔ یوں ہی اونچا، اونچا بلند آواز میں حتیٰ کہ نڈھال ہوکر اس نے صوفے سے ٹیک لگالی۔ تب وہ شخص اٹھا۔ اس کے قریب آ کر بازو سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور سہارا دیتا ہوا اسے اس کے کمرے تک لایا اور بیڈ پر بٹھاتے ہوئے خیر دین کو آواز دی۔ خیر دین نے آ کر اسے انجکشن لگایا اور اس نے نرمی سے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے لٹادیا۔

''سو جائیں...... پرسکون ہوجائیں پھر بات کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں آپ کی والدہ کو کیسے تلاش کیا جائے۔''

''نہیں، مجھے ابھی جانا ہے...... ابھی جاؤں گی میں۔ مجھے نہیں سونا...... میری اماں۔''

اس نے کئی بار اٹھنے کی کوشش کی اور ہر بار اس نے اسے کندھوں سے تھام کر لٹادیا۔ کچھ دیر بعد اس کی

آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ سو گئی۔ اگلے چند دن ایسا ہی ہوتا رہا۔ وہ اٹھتی، جانے کی ضد کرتی، روتی چلاتی۔ ماسی وزیراں بہلا پھسلا کر تھوڑا بہت کچھ کھلاتی اور پھر خیر دین اسے انجکشن لگا دیتا۔ وہ سو جاتی تھی لیکن پھر جیسے اسے صبر آتا گیا۔

ایک روز وہ جاگی تو روئی چلائی نہیں، خاموشی سے ناشتا کر کے دوپٹا اوڑھ کر بیٹھ گئی۔ ماسی وزیراں نے اسے دو جوڑے کپڑے لا کر دیے تھے کہ اس کے اپنے کپڑے بہت میلے ہو گئے تھے۔ یہ کپڑے اسے کچھ کھلے تھے لیکن اس نے پہن لیے تھے۔

''صاحب اندازے سے لے کر آئے ہیں۔''

اس نے بتایا۔

تین چار دن میں جب کپڑے میلے ہو جاتے تو وہ وزیراں کے کہنے پر تبدیل کر لیتی۔ آج ناشتے کے بعد کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ ''وہ یہاں کیوں ہے۔ ایک اجنبی نامحرم شخص کے گھر میں' اسے جانا چاہیے، واپس رابعہ کے گھر۔ اماں شاید نہیں رہیں۔''

آنسو اندر گرے لیکن دل ماننے کو تیار نہ تھا۔

رابعہ کے علاوہ اور کون تھا اس کا مخلص، ہمدرد......

''میں پہلے چلی جاؤں پھر سوچ لوں گی کیا کرنا ہے۔ ہاں، آج میں اس سے کہوں گی کہ اب میں ٹھیک ہوں، چکر بھی نہیں آ رہے ہیں تو آج وہ مجھے کوچ یا بس میں بٹھا آئے......'' اور جب وہ آیا اس کا حال دریافت کرنے تو یوں تیار بیٹھے دیکھ کر لمحہ بھر کو حیران ہوا۔

''گڈ! آج آپ ٹھیک لگ رہی ہیں۔ لگتا ہے آپ نے حقیقت کو قبول کر لیا ہے۔''

''جی... شاید یہ بھی ایک آزمائش ہے۔ آپ نے جہاں اتنی مہربانی کی ہے، وہاں ایک اور احسان کر دیجیے۔ اگر یہاں سے کوئی بس ڈائریکٹ میرپور یا مظفر آباد جاتی ہو، اس کا ٹکٹ لے کر اس میں بٹھا دیں۔''

''یہاں سے ڈائریکٹ تو کوئی نہیں جاتی۔ پہلے راولپنڈی جانا پڑے گا لیکن آپ جائیں گی کہاں؟'' وہ عادت کے مطابق دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''گھر...... گھر جانا ہے مجھے۔''

''کون سے گھر؟'' وہ ہولے سے ہنسا تھا۔ اس ہنسی میں کیا تھا، تمسخر یا کچھ اور وہ نہ سمجھ سکی تو اسے دیکھنے لگی۔

''اپنی دوست کے گھر یا اپنے ماموں کے گھر جو آپ کی شادی اپنے ابنارمل بیٹے سے کرنا چاہتے تھے؟''

حیرت سے اس کی آنکھیں جیسے پھٹنے کو تھیں۔

''آپ...... آپ کو کیسے......؟''

''نیم غنودگی میں آپ اپنے متعلق سب کچھ بتا چکی ہیں۔'' وہ دروازے کے پاس سے ہٹ کر اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''اپنی دوست کے گھر۔'' اس کا اعتماد آہستہ، آہستہ واپس آ رہا تھا۔

''آپ کی دوست کے گھر والے آپ کو قبول کر لیں گے کیا۔ کن خوابوں میں ہیں آپ...... لڑکی ایک روز گھر سے باہر رات گزار لے تو سگے ماں باپ اسے قبول نہیں کرتے تو یہ پھر غیر ہیں۔ اتنے بے غیرت تو نہیں ہوں گے کہ ایک لڑکی بیس دنوں بعد آئے اور وہ اسے گھر میں گھسنے دیں۔ جبکہ وہ ان کی جوان بیٹی کی سہیلی ہو۔ وہ تو اپنی بیٹی کو اس کے سائے سے بھی دور رکھنا چاہیں گے۔''

''بیس دن......؟'' اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔ اسے خود گزرتے شب و روز کا اندازہ نہیں تھا۔

''ہاں، بیس دن۔'' وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تو......'' لمحہ بھر بعد اس نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے جانا تو ہے۔ آپ پلیز مجھے راولپنڈی جانے والی بس پر بٹھا دیں۔ میں یہاں ساری زندگی نہیں رہ سکتی۔''

''نہیں...... آپ ساری زندگی یہاں رہ سکتی ہیں۔'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کیوں...... کیا رشتہ ہے میرا آپ سے جو میں یہاں رہوں؟'' وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

''رشتہ بننے میں کون سا دیر لگتی ہے، بنا لیں گے۔''

وہ آج پچھلے دنوں سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔

اس کے اندر بہت سے خوف جاگ اٹھے۔ اس نے چاہا کہ وہ باہر نکل جائے لیکن اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔

''نہیں، آپ یہاں سے نہیں جاسکتیں...... بیٹھ جائیں آرام سے۔'' اس کے لہجے میں نامعلوم سی سختی تھی۔

''یہ بیس دن میں نے یوں ہی ضائع نہیں کیے۔ اب واپسی کا بھول جائیں آپ۔''

''میں......''

اس نے کچھ کہنا چاہا تب ہی اس کا فون بج اٹھا۔ پاکٹ سے فون نکالتا ہوا ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ کہنے سے منع کرتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ ساکت سی کھڑی تھی۔ یہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ، وہ یہاں کہاں پھنس گئی تھی۔

''نہیں، یا اللہ نہیں، میرے ساتھ کچھ برا مت کرنا۔'' وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور اسے کھولنا چاہا لیکن دروازہ باہر سے لاکڈ تھا۔ اس نے دو، تین بار کھولنے کی کوشش کی اور پھر بے یقینی سے دروازے کو دیکھتی ہوئی ہولے، ہولے پیچھے ہٹتی گئی، یہاں تک کہ بیڈ کے ساتھ ٹکرا کر رک گئی۔ وہ کتنی بھی بااعتماد اور بہادر کیوں نہ ہوتی، تھی تو وہ ایک لڑکی ہی۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''یہ شخص میرے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟'' اس نے اس کی آخری بات یاد کرنے کی کوشش کی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے یہ بیس دن یوں ہی ضائع نہیں کیے۔

''تو کیا وہ مجھے کسی غلط نیت سے اٹھا کر لایا تھا اور اماں...... کیا خبر اس نے اماں کے متعلق بھی جھوٹ بولا ہو۔ کیا پتا اماں بہت زخمی ہوں، ابھی وہاں ہی ہوں اسپتال میں۔ لیکن بیس دن ہوگئے...... اوہ میرے خدا...... کیا کروں میں۔'' وہ اٹھ کر پھر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی اور دوپہر تک اس نے کئی بار کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کبھی رونے لگتی، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی، کبھی گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگنے لگتی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ ''وزیراں سے مدد مانگوں... عورت ہے، شاید کہ وہ مجھ پر ترس کھائے۔ رحم آجائے۔'' لیکن جب تین بجے کے قریب دروازہ کھلا تو وزیراں کے بجائے خیر دین کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر آیا تھا۔

''وزیراں...... ماسی وزیراں کہاں ہے؟'' بے اختیار.... اس کے لبوں سے نکلا۔

''کام کر کے چلی گئی ہے اپنے گھر۔'' خیر دین نے ٹرے میز پر رکھی۔

اس نے سوچا وہ اس کی منت کرے لیکن وہ تو شکل سے ہی کوئی غنڈا لگتا تھا۔ یہ بڑی، بڑی مونچھیں، موٹی، موٹی آنکھیں جن میں سرخ ڈورے تیرتے رہتے تھے۔ اسے تو ویسے ہی خوف آتا تھا، اس سے ڈر لگتا تھا۔ ''ایسا نہ ہو کہ اس سے مدد مانگ کر میں کسی اور مصیبت میں پڑ جاؤں۔ وہ اجنبی شخص شکل سے مہذب اور پڑھا لکھا لگتا ہے۔ کیا خبر میری بات مان لے۔ منت کرلوں گی۔ ہاں بہن کا واسطہ دوں گی تو شاید...... یہ تو شکل سے ہی جنگلی لگتا ہے۔''

''سنو، آپ کے صاحب کہاں ہیں؟ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔'' وہ جانے لگا تو اس نے روکا۔

''گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے اس کی سوجی ہوئی آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کو تاسف سے دیکھا۔

''فون...... فون ہوگا؟ مجھے اپنے گھر فون کرنا ہے۔''

لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر باہر چلا گیا اور باہر لاک میں چابی گھمانے کی آواز آئی تو وہ اٹھتے، اٹھتے بیٹھ گئی۔ وہ یہاں قید تھی اور اسے یہاں سے نکلنا تھا لیکن کیسے...... کیسے نکل سکے گی وہ یہاں سے۔ شاید اب باقی ماندہ زندگی یہاں اسی قید میں گزارنی ہوگی۔ یہ شخص اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ جو بھی سلوک کرے گا، وہ اچھا نہیں ہوگا۔ یقیناً اس کے ساتھ کچھ برا ہونے والا تھا۔

''یا اللہ مدد فرما۔'' اس نے پھر اپنے رب کو پکارا

اور آنسوؤں نے پھر یلغار کر دی۔ ہاتھ گود میں دھرے وہ یوں ہی ساکت بیٹھی تھی۔ کبھی، کبھی ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کرتی لیکن تھوڑی دیر بعد رخسار پھر بھیگ جاتے۔ خیر دین برتن اٹھانے آیا تو تب بھی وہ ایسے ہی بیٹھی تھی۔ اس نے ٹرے کی طرف دیکھا۔

''آپ نے کھانا نہیں کھایا؟''

''بھوک نہیں ہے، لے جاؤ۔'' رو رُو کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

''زندگی سے لڑنے کے لیے کھانا تو پڑے گا ہی بی بی، بھوکا رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' وہ ٹرے اٹھائے بغیر واپس چلا گیا تو اس نے ٹرے اپنی طرف کھسکائی۔ اسے یہاں سے نکلنا تھا اور بھوکا رہ کر اسے اپنی توانائی نہیں کھونی تھی۔ اگلے دو دن اس نے... خیر دین کے سوا کسی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ شخص جو اسے یہاں لایا تھا، پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ خیر دین سے وہ جب بھی آتا پوچھتی لیکن وہ جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ سوچ، سوچ کر تھک گئی تھی لیکن کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی اور وہ شخص جس سے وہ کسی اچھائی کی امید لگائے بیٹھی تھی، وہ تیسرے دن آیا تو وہ بے قراری سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ؟''

''اوہ...... یہ بے قراری۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا روم چیئر پر بیٹھ گیا۔

''مجھے گھر جانا ہے۔ پلیز، مجھے گھر جانے دیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔ آپ نے مجھے یہاں کیوں قید کر رکھا ہے؟'' وہ روہانسی ہوئی۔

''بہت مشکل سوال ہے۔ یوں تو اس کے کئی جواب نکلتے ہیں لیکن اب ایک ہی جواب ہے کہ دل کو بھا گئی ہیں آپ۔ پہلے تو کچھ اور ہی مقصد تھا یہاں لا کر رکھنے کا لیکن اب جیسا کہ بتایا ہے کہ دل کو اچھی لگنے لگی ہیں آپ۔ اب تک کی زندگی تنہا گزاری ہے، اب جی چاہتا ہے کہ کوئی اپنی زندگی کا بھی ساتھی ہو جو میرے گھر آنے کا انتظار کرتا ہو، میرے لیے پریشان ہوتا ہو...... اور یہ سب احساسات آپ کو دیکھ کر، آپ سے ملنے کے بعد پیدا ہوئے ورنہ مجھے کبھی اپنی تنہا زندگی بری نہیں لگی تھی۔ مجھے کبھی اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن میں آپ کو آپ کی مرضی سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ کچھ دیر ہونقوں کی طرح اسے دیکھتی رہی جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو پھر فوراً ہی نفی میں سر ہلانے لگی۔

''نہیں، پلیز نہیں...... خدا کے لیے مجھے اپنے گھر جانے دیں۔''

''اپنے گھر......!'' وہ تمسخر سے ہنسا۔

''مجھے یہاں سے جانا ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ میرا گھر ہے یا نہیں لیکن مجھے یہاں نہیں رہنا۔ آپ مجھے یہاں قید کر کے نہیں رکھ سکتے۔'' اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔

''اچھا...... لیکن میں نے تو آپ کو یہاں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔'' اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''لیکن مجھے نہیں رہنا یہاں۔'' ضدی سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی تو اس نے ہاتھ ذرا سا بلند کیا۔

''اوں ہوں...... کوئی فائدہ نہیں باہر جانے کا۔ گیٹ پر گارڈ ہے اور اسے حکم ہے کہ میری اجازت کے بغیر آپ یہاں سے جانے کی کوشش کریں تو آپ کو گولی مار دی جائے۔ اس لیے سکون سے بیٹھ جائیں۔''

اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور نچلے ہونٹ کو بے دردی سے دانتوں تلے کچلتی ہوئی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے یوں ہی سر جھکائے بیٹھی رہی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ عام سی شکل صورت کا تیس سے چالیس سال کی عمر کے درمیان کا مرد تھا۔ اس کا لباس اور انداز اسے دولت مند ظاہر کرتے تھے اور اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ اس چمک کو کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔

''آخر آپ ہیں کون اور کیوں میرے ساتھ ایسا کر رہے ہیں...... میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے......

آپ مجھے جھاڑیوں میں ہی پڑا رہنے دیتے، کیوں اٹھا کر لائے ہیں۔ کون ہیں آپ...... لڑکیوں کے بیوپاری، اسمگلر، ڈاکو...... کون ہیں؟'' وہ ہذیانی انداز میں بولتی چلی گئی لیکن وہ یوں ہی سکون سے بیٹھا اسے دلچسپی اور شوق سے دیکھتا رہا۔

''میں کون ہوں...... اچھا سوال ہے اور یہ جاننے کا حق آپ کو ہے...... کیونکہ آپ میری زندگی میں شامل ہونے جارہی ہیں، اس لیے میرے متعلق سب کچھ جاننا آپ کا رائٹ (حق) ہے...... میں جو کچھ آپ کو بتانے جارہا ہوں، اس کے متعلق چند خاص لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا...... آپ نے کہا...... کون ہوں میں، لڑکیوں کا بیوپاری...... تو میں لڑکیوں کا بیوپاری ہوں۔'' وہ اب سنجیدگی سے بات کررہا تھا۔ آنکھوں کی چمک اور لہجے کی شوخی ختم ہوگئی تھی...... وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کی رنگت زرد پڑگئی تھی۔

''میں یہاں سے لڑکیاں سمندر پار لے کر جاتا ہوں اور وہاں اپنے باس کے حوالے کردیتا ہوں۔ یہ لڑکیاں اپنی مرضی سے اپنی خواہشوں کے حصول کے لیے میرے جال میں پھنستی ہیں اور پھر......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی زرد ہوتی رنگت کو دیکھا اور اس کے لبوں کے گوشے میں ایک مسکراہٹ نمودار ہوکر معدوم ہوگئی۔

''مجھے میرے کام کا معاوضہ ملتا ہے...... آپ سمجھ سکتی ہیں کہ ان لڑکیوں کا کیا انجام ہوتا ہوگا...... کچھ عرصہ کسی رئیس کے حرم میں رہ کر انہیں کبھی یورپ کے کسی نائٹ کلب میں بیچ دیا جاتا ہے اور کبھی باقی ماندہ زندگی وہ ایک کال گرل بن کر رہ جاتی ہیں...... میں اس کاروبار میں کیوں اور کیسے آیا؟ میں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔''

ثناشہ نے اس لمحے اس کے لیے بے حد نفرت محسوس کی۔ چند دن پہلے تک یہ شخص اسے بے حد مہربان اور ہمدرد لگا تھا اور آج اتنا ہی قابلِ نفرت لگ رہا تھا۔

''آپ کو جب میں نے جھاڑیوں میں سے اٹھایا تو میری نیت بری نہ تھی۔ وہ محض انسانی ہمدردی تھی لیکن پھر آپ کے حسن نے میری نیت خراب کردی اور میں نے سوچا اتنی حسین لڑکی تو مجھے مالا مال کردے گی۔ منہ مانگا معاوضہ...... امیرزادے تو پاگل ہوجائیں گے' یہ حسین چہرہ اور دلکش بدن دیکھ کر...... لیکن پھر کچھ دن گزرے تو مجھے اپنی تنہا زندگی کا خیال آنے لگا، کتنی عجیب بات تھی کہ میں نے کبھی اپنا گھر بسانے کا نہیں سوچا تھا۔ میں جو پیسے کمارہا تھا وہ بھلا میرے بعد کس کام کے تو مختصراً یہ کہ میں نے آپ سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ میں اپنے کاروبار میں کبھی بدنیت نہیں رہا۔ میں نے جتنی لڑکیوں کو فروخت کیا، کسی کو بری نظر سے نہیں دیکھا۔ آپ میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہیں۔ میری عمر اس وقت پینتیس سال ہے۔ پہلی بار میرے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ میرا گھر ہو، بچے ہوں۔ میں آپ کو ایک اچھی اور بہترین زندگی دوں گا۔ میرے کاروبار کا آپ کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ گوجرانوالہ اور لاہور میں میری کوٹھیاں ہیں۔ آپ جہاں رہنا پسند کریں گی، وہاں ہی رہ لیں گے۔ میں سال میں ایک دو ماہ کے لیے دو بار باہر جاتا ہوں...... اور باقی کا وقت میں یہاں اپنے گاؤں والے اس گھر میں رہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک اچھی اور بہترین زندگی گزاریں گے۔ یوں بھی آپ کا اب اس دنیا میں کون ہے؟''

اسے جیسے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گی لیکن اس نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی، کبھی بھی نہیں...... مر کر بھی نہیں۔''

''اچھا...... لیکن آپ کے پاس کوئی اور چوائس نہیں ہے۔'' اس کے چہرے اور لہجے کا رنگ بدلا تھا۔

''یا تو مجھ سے شادی کرلیں یا پھر کسی...... کے حرم کی زینت بن جائیں اور جب اس کا دل بھر جائے گا تو آپ کہاں ہوں گی پھر...... میں بتاچکا ہوں...... دوسرا کوئی آپشن نہیں ہے آپ کے پاس۔''

وہ کھڑا ہوگیا۔ اس کے لہجے میں جو کرختگی اور سختی

تھی، اس نے نتاشہ کو ڈرا دیا تھا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ایک خوب صورت پاکیزہ زندگی یا......''

''ایک تیسرا آپشن بھی ہے۔'' اس نے دل کڑا کر کے اس کی طرف دیکھا۔

''موت...... میں خود کو ختم کرلوں گی۔''

''حرام موت مریں گی آپ...... خیر، اچھا ہوا آپ نے بتا دیا۔ میں اب خیر دین سے کہہ دوں گا کہ اور زیادہ دھیان رکھے آپ کا...... اور یہاں سے بھاگنے کا بھی مت سوچیے گا کہ گارڈ کے علاوہ کتا بھی ہے جو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔''

اس نے جھرجھری سی لی۔

''میں کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ ایک ہفتہ ہے آپ کے پاس، اچھی طرح سوچ لیں...... میں آپ کے فیصلے کا احترام کروں گا۔ انتخاب آپ کا...... یہ یا...... وہ......''

بات مکمل کر کے وہ باہر نکل گیا۔ وہ ساکت اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

''یا اللہ میری مدد فرما، کیا کروں تو ہی مجھے کوئی راستہ دکھا۔ مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔'' وہ اس شخص سے جو اتنے غلیظ کاروبار میں ملوث تھا شادی نہیں کر سکتی تھی...... بھلے وہ اسے کتنی بھی بہترین زندگی دے...... اور دوسری طرف کسی کے حرم کی زینت بننا...... آنسو ایک بار پھر اس کے رخساروں پر آہستگی سے بہہ رہے تھے اور وہ دعا کر رہی تھی، اللہ کو پکار رہی تھی اور اللہ اپنے بندوں کی پکار سنتا ہے۔ اس کی بھی سن لی گئی تھی۔

خیر دین کھانے کے خالی برتن اٹھانے کمرے میں آیا تھا اور پھر اسے یوں تڑپ، تڑپ کر روتے اور اللہ سے فریاد کرتے دیکھ کر اسی خاموشی سے واپس چلا گیا تھا جس آہستگی سے اس نے دروازہ کھولا تھا، اسی آہستگی سے بند کر دیا تھا۔ اس نے برتن نہیں اٹھائے تھے۔

اس کا دل اس لڑکی کے لیے دکھی ہو رہا تھا۔ وہ دروازہ لاک کر کے خاموشی سے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا تھا لیکن اس کے کانوں میں اس کی سسکیاں، اس کا رونا، تڑپ، تڑپ کر اللہ سے فریاد کرنا گونج رہا تھا اور وہ...... بے چین سا تھا۔ اس کا باس ہفتے بھر کے لیے دبئی جا چکا تھا اس لڑکی کی کڑی نگرانی کا حکم دے کر۔ شاید اگلی بار وہ اسے بھی ساتھ لے جائے گا اور...... اگر وہ اس لڑکی کو چپکے سے گھر سے نکال دے تو...... اور یہاں سے نکل کر وہ کسی اور کے ہتھے چڑھ گئی تو...... پتا نہیں اس کا گھر کہاں ہے اور اگر وہ خود اسے اس کے گھر چھوڑ آئے تو...... گارڈ جبار سے کہے کہ باس کا فون آیا ہے، اس لڑکی کو کہیں پہنچانا ہے، جبار اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔ اسے بھی اس سے سروکار نہیں ہوتا تھا کہ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے۔ چند بار پہلے بھی باس یہاں کسی نہ کسی لڑکی کو لے کر آیا تھا...... لیکن پھر اس کا اپنا انجام کیا ہوگا باس اسے زندہ نہیں چھوڑے گا...... اور اگر وہ کہیں روپوش ہو جائے تو اس کے بوڑھے ماں باپ، چھوٹے بھائی، ان کے بیوی بچے...... باس انہیں نہیں چھوڑے گا۔ اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جب وزیراں نے آ کر بتایا کہ وہ کام ختم کر کے جا رہی ہے۔ باس یہاں پر نہ ہوتا تو وہ کچھ جلدی چلی جاتی تھی۔ سالن وغیرہ تیار کر جاتی تھی اور وہ اپنے اور جبار کے لیے روٹیاں تنور سے لے آتا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔''

اسے جانے کا کہہ کر وہ پھر سوچوں میں کھو گیا۔ کئی سال پہلے وہ ایک چھوٹے سے گوٹھ میں رہتے تھے۔ تھوڑی سی زمین تھی، قناعت بھری پُرسکون زندگی تھی کہ ایک بااثر زمیندار کے بیٹے نے اس کی اٹھارہ سالہ اکلوتی بہن کو اٹھا لیا۔ جس روز اس کی لاش ملی اسی روز اس نے اس کے بیٹے کو کلہاڑی کے وار کر کے اپنی دانست میں مار دیا تھا لیکن وہ بچ گیا تھا اور اسے جیل بھیج دیا گیا تھا جہاں اس کی ملاقات جس شخص سے ہوئی وہ اس کے باس کے باس کا بندہ تھا۔ اس سے دوستی ہوئی اور وہ اپنے ساتھ اسے بھی جیل سے نکال لے گیا۔ وہ اب اپنے گوٹھ نہیں جا سکتا تھا۔ جانتا تھا زمیندار اسے مروا دے گا اور اس کے گھر والوں پر زندگی تنگ کر رکھی ہوگی...... اس کے اندر اب بھی ایک

آگ جل رہی تھی سوجیل کے اس دوست کے کہنے پر وہ باس کے بندوں میں شامل ہوگیا۔ باس نے نہ صرف یہ کہ اس کے گھر والوں کو گوٹھ سے نکال کر پنجاب کے ایک گاؤں میں سیٹل کر دیا، کھیتی باڑی کے لیے زمین بھی خرید کر دی جہاں وہ سکون سے زندگی گزار رہے تھے بلکہ اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ کئی سال وہاں رہنے کے بعد اس کی اپنی خواہش پر اسے پاکستان بھجوا دیا تھا جہاں اس کا باس ملک ایاز تھا جو لڑکیوں کو لے جانے کے علاوہ کئی دوسرے کام بھی کرتا تھا اور وہ یہاں اس کا مددگار تھا۔ دو تین بار باس کے حکم پر وہ بھی لڑکی کے ساتھ باہر گیا تھا۔ کبھی اپنی بہن کا خیال آتا تو اس کے اندر آگ دہکنے لگتی لیکن پھر اس خیال سے یہ آگ ٹھنڈی ہو جاتی کہ زمیندار کا بیٹا مُردوں سے بدتر زندگی گزار رہا تھا۔

آج اسے اپنی وہ شہزادی بہن بہت یاد آ رہی تھی اور وہ بے چین سا ہو کر اس بند دروازے کی طرف دیکھتا جس کے پیچھے وہ لڑکی تھی جس نے اسے آج اپنی بہن کی موت یاد دلا دی تھی۔ وہ اس لڑکی کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن کیسے؟ وہ سوچتا رہا...... سوچتا رہا اور جب رات کا کھانا دینے وہ اس کے کمرے میں گیا تو وہ نڈھال سی بیٹھی تھی۔ بیڈ سے ٹیک لگائے نیچے کارپٹ پر۔

''بی بی، یہ کھانا کھالیں۔''

اس نے ٹرے نیچے کارپٹ پر اس کے سامنے رکھ دی۔ تو اس نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ایک مہربانی کرو بھائی، کہیں سے زہر لا دو مجھے۔''

اس کا دل جیسے لفظ بھائی پر تڑپ اٹھا۔ اس نے جیب سے موبائل فون نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اس روز فون کا پوچھا تھا۔ اس نے جیسے جھپٹ کر فون لیا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ رابی کو فون کرے گی۔ وہ اس کی دوست ہے، اسے سمجھتی ہے۔ دو سال انہوں نے ایک روم میں گزارے ہیں پھر انہیں پتا ہوگا بس کے حادثے کا۔ وہ بتائے گی کہ سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ کئی دن بے ہوش رہی تھی۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی کہ اسے گھر میں گھسنے نہ دے۔ کانپتی انگلیوں کے ساتھ وہ نمبر ملا رہی تھی لیکن دوسری طرف سے کبھی ٹوں، ٹوں کی آواز آنے لگتی، کبھی ریکارڈنگ چلنے لگتی کہ یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے...... اس نے دل ہی دل میں رابعہ کا نمبر کتنی بار دُہرایا۔ شاید وہ کہیں کچھ غلط کر رہی تھی، بھول گئی تھی۔ اس نے نمبر بدل، بدل کر ملایا لیکن بے سود...... اس کے فون میں رابعہ کا نمبر save تھا لیکن اس کے ذہن میں تھا کہ یہ ہی نمبر ہوگا۔ اس کا فون تو اس کے شولڈر بیگ میں ہی رہ گیا تھا جو حادثے کے وقت اس کی گود میں تھا۔ اس نے...... بے بسی سے فون اس کی طرف بڑھایا۔ رابعہ کا لینڈ لائن نمبر اسے اچھی طرح یاد تھا۔

''کیا لینڈ لائن سے بات ہو سکتی ہے۔ کال بک کروانی ہوگی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''باس نے چند سال پہلے جب یہ موبائل مجھے لے کر دیا تو احتیاط کی وجہ سے فون کٹوا دیا تھا۔'' اس کی آواز بہت آہستہ تھی، سرگوشی جیسی۔ نتاشہ کی آنکھیں یک دم آنسوؤں سے بھر گئیں تو اس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''موقع ملتے ہی میں آپ کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا پھر جو آپ کی قسمت۔''

پھر وہ پہلے والے برتن اٹھا کر فوراً ہی باہر چلا گیا اور باہر سے دروازہ لاک نہیں کیا کہ باس نے کہا تھا۔

''اس کی اب ضرورت نہیں۔ وہ لاؤنج سے کچن تک جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن گیٹ تک جانے کی اجازت نہیں ہے اسے۔''

وہ چند لمحے بند دروازے کو دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں سے جھرنے بہہ نکلے اور وہ فوراً ہی شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اللہ نے اس کی پکار سن لی تھی اور دشمنوں میں سے ہی ایک بندے کے دل میں اس کے لیے رحم پیدا کر دیا تھا...... بے شک اللہ بہت رحیم و کریم ہے۔

اور پھر دو دن بعد خیر دین کو موقع مل گیا۔ وزیراں ہر ماہ اپنے بیمار شوہر کو گوجرانوالہ ڈاکٹر کے پاس لے کر

جاتی تھی۔ اُسے ٹی بی تھی۔ اس روز وہ گیٹ پر جبار کو بتا گئی تھی کہ وہ آج نہیں آئے گی، شوہر کو لے کر جانا ہے.....اور خیر دین نے فوراً ہی پلان بنالیا کہ آج کے بعد شاید اسے موقع نہ ملے کہ دو دن سے سوچ، سوچ کر اس کا دماغ تھک گیا تھا لیکن کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیسے وہ اس لڑکی کو یہاں سے نکالے کہ اس کا نام نہ آئے۔

ناشتا دینے گیا تو اسے کہہ آیا کہ ''آج وہ ذہنی طور پر تیار رہے۔ وزیراں نہیں ہے اور وہ کسی بہانے سے گارڈ جبار کو بھی کہیں بھیج دے گا تو وہ گیٹ سے نکل کر دائیں طرف چلی جائے۔ کچھ آگے جاکر بائیں مڑ جائے اور پھر سیدھا چلتی جائے تو سڑک آجائے گی۔ وہاں سے شاید کوئی سواری مل جائے، اللہ آپ کا مددگار ہو۔'' اس نے کچھ پیسے جیب سے نکال کر اسے دیے۔

''رکھ لیں، ضرورت پڑے گی۔''

''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔'' اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''میں ہمیشہ آپ کے لیے دعا کروں گی۔''

وہ بنا کچھ کہے واپس چلا گیا لیکن وہ اس وقت تک بے چین اور مضطرب رہی جب تک دوپہر کے وقت وہ دوبارہ نہیں آیا۔ اس پر عجیب سے گھبراہٹ طاری تھی۔

''آپ لاؤنج میں چل کر بیٹھیں بلکہ ٹی وی لگالیں۔''

پھر وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے گیٹ پر آیا۔

''جبار بھائی! میرا پیٹ خراب ہے اور معدے میں بھی درد ہورہا ہے۔ ایک مہربانی کروگے۔ اپنے لیے روٹیاں لے آؤ تنور سے۔ رات کا سالن پڑا ہے۔ شام کو تازہ پکالوں گا۔ مجھے تو کچھ کھانا نہیں ہے اس وقت۔''

''ٹھیک ہے یارا، مہربانی کیسا، لے آتا ہوں۔ کہو تو تمہارے لیے بھی حکیم صاحب سے دوا لیتا آؤں؟''

جبار کا تعلق مردان سے تھا۔ کچھ ماہ پہلے ہی اسے رکھا گیا تھا۔

''نہ.....نہیں.....ٹھیک ہوجاؤں گا شام تک۔ وہ دراصل کل کچھ زیادہ کھالیا تھا تو پیٹ اپ سیٹ ہوگیا تھا۔''

''ہاں یار، کل ماسی وزیراں نے پالک گوشت بنایا بھی تو مزے کا تھا۔ میں بھی تین روٹیاں کھا گیا تھا۔'' جبار خان نے قہقہہ لگایا۔

''یہ پیسے رکھ لو۔'' اس نے جیب سے روپے نکال کر اسے پکڑائے اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دُہرا ہوگیا۔

''میں گیٹ بند کر کے باتھ روم جارہا ہوں۔''

''ہاں، ہاں جاؤ.....میں بھی روٹیاں لینے جاتا ہوں۔''

جبار خان کے جانے کا اندازہ کرکے وہ تیزی سے واپس مڑا اور گیٹ کی جھری میں سے جھانک کر دیکھا۔ جبار خان کوئی پشتو گیت گاتا ہوا مست سا آبادی کی طرف جارہا تھا۔ یہ گھر آبادی سے کچھ ہٹ کر تھا۔ پھر وہ تیزی سے تقریباً دوڑتا ہوا لاؤنج تک آیا۔

''آجاؤ بی بی، جلدی کرو۔'' وہ تقریباً دوڑتے ہوئے لاؤنج تک آئے تھے۔ خیر دین نے گیٹ کھول کر باہر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ جبار خان بھی نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ اس نے اسے اشارہ کیا۔

''میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔ میں یہی ظاہر کروں گا کہ میں باتھ روم میں تھا اور تم گیٹ کھول کر چلی گئیں۔ جیسا میں نے بتایا تھا، اسی طرح کرو۔'' اس نے ہاتھ سے دائیں طرف اشارہ کیا۔

''وہ.....وہ کتا ہے یہاں؟'' وہ چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

''نہیں..... مطلب تھا تو مگر کچھ عرصہ پہلے مر گیا۔ اب جاؤ، اس سے پہلے کہ جبار روٹیاں لے کر آجائے، تم سڑک تک پہنچ جاؤ۔''

وہ ممنون نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی گیٹ سے نکل کر دائیں طرف چل پڑی اور وہ گیٹ کو یوں ہی نیم وا چھوڑ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ملازموں کے لیے گیٹ کے پاس ہی باتھ روم تھا۔ اسے جبار خان کے آنے پر ظاہر کرنا تھا کہ وہ ابھی تک باتھ روم میں ہی تھا.....لیکن ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسے جبار کی آواز سنائی دی۔

''اوئے خیر دین، کدھر ہے، یہ گیٹ کیوں کھلا ہے؟ کیا وزیراں آ گئی ہے...... چلو اچھا ہے تنور بھی آج بند تھا، روٹیاں نہیں ملیں۔''

اور خیر دین جو باتھ روم کے قریب ہی کھڑا تھا، جبار کی آواز سن کر فوراً باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ چند لمحوں بعد گھبرایا ہوا سا باہر نکلا۔

''نہ...... نہ وزیراں تو نہیں آئی...... لیکن یہ گیٹ کس نے کھولا؟ میں تو بند کر کے گیا تھا۔ اوہ میرے خدایا...... وہ لڑکی...... کہیں وہ تو۔'' اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ بھاگتا ہوا اندر گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد اسی طرح بھاگتا ہوا باہر آ گیا۔ ''وہ اندر کہیں نہیں ہے، کسی کمرے میں بھی نہیں۔ باس تو مار ڈالے گا۔''

''ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا، ہم دیکھتا ہے۔'' جبار گیٹ سے باہر نکلا تو وہ بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ بائیں طرف جانے لگا تو جبار نے اس کا بازو پکڑا۔

''اِدھر...... میں نے موڑ پر کسی کے دوپٹے کی جھلک دیکھی تھی، یقیناً وہی ہوگی...... اور بھلا اس کڑکتی دوپہر میں کون اِدھر آ سکتا ہے۔''

اب وہ دونوں تیز تیز چلتے ہوئے دائیں طرف جا رہے تھے۔

''وہ یقیناً سڑک کی طرف ہی گئی ہوگی۔''

جیسے ہی ایک گلی بائیں طرف نظر آئی، جبار خان اس طرف بڑھا۔

''یا اللہ مدد فرمانا مظلوم کی، میری کوشش رائگاں نہ جانے دینا۔'' جبار خان کے ساتھ بھاگتے ہوئے... ردین دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا پھر دور روڈ کے کنارے وہ کھڑی نظر آ گئی۔

''وہ رہی۔''

جبار خان نے اشارہ کیا اور اس کی طرف بھاگا۔ اس نے بھی شاید انہیں دیکھ لیا تھا کہ وہ روڈ کراس کر کے پوری قوت سے بھاگنے لگی تھی...... کبھی بھاگتے، بھاگتے مڑ کر دیکھتی...... پھر سڑک کے ساتھ بہتی نہر پر اس کی نظر پڑی اور اس نے بلا سوچے سمجھے نہر میں چھلانگ لگا دی۔

''او خانہ خراب۔'' جبار خان سڑک کے دوسری طرف ہی رک گیا تھا۔

''تمہیں تیرنا آتا ہے جبار؟'' خیر دین نے ڈرتے، ڈرتے پوچھا۔

''نہ...... اور تمہیں؟''

''نہیں، مجھے تو بچپن سے ہی پانی سے ڈر لگتا ہے۔'' خیر دین نے سچ بتایا تھا۔

''میرا چاچا سندھو میں ڈوب کر مر گیا تھا، تب سے۔''

''تو سمجھو مجھے بھی پانی سے ڈر آتا ہے۔'' جبار کے لبوں پر پُراسراری مسکراہٹ تھی۔

''خس کم، جہاں پاک۔'' اس نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ مر جانا چاہیے بے غیرتوں کو۔''

''اور باس کو کیا جواب دیں گے؟''

''جو سچ ہے، ام بتا دے گا۔'' جبار خان نے... بے پروائی سے کہا اور پھر اس کی نظر سڑک پر کچھ فاصلے پر کھڑی گاڑی پر پڑی تو چونکا۔

''لگتا ہے گاڑی والے نے لڑکی کو نہر میں چھلانگ لگاتے دیکھ لیا ہے...... جلدی واپس چلو، کہیں ام پھنس ہی نہ جائیں۔''

اور وہ بہت بھاری دل کے ساتھ اس کے ساتھ تیز، تیز چلنے لگا۔

''کیا وہ گاڑی والا اسے بچا لے گا؟''

''پرائے پھڈے میں کوئی نہیں پڑتا، یارا چل۔'' جبار نے چلتے، چلتے اس کے بازو پر ہاتھ مارا۔

وہ اس کے اس طرح ڈوب مرنے پر دکھی بھی تھا اور کچھ مطمئن بھی کہ چلو عزت تو بچ گئی۔

وہ سر جھکائے چل رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے جھاڑیوں میں پڑی اپنی شہزادی بہن کی لاش آ رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

ناولٹ

تمہارے کھوج میں

digest novels lovers group ❤️❤️

نکہت سیما

تیسرا حصہ

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ تیمور علی بے چینی سے کروٹیں بدل رہے تھے کہ اتنا تھکا دینے والا دن گزارنے کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ حالانکہ ان کا خیال تھا کہ بیڈ پر لیٹتے ہی گہری نیند سو جائیں گے لیکن پہلے تو کرن نے ضد کی کہ آج وہ اس کے روم میں ہی سوئیں کیونکہ مہراں انیکسی میں تھی......
اور پھر وہ کرن کے سونے تک اس کے کمرے میں ہی رہے تھے۔ کھانا انہوں نے لاہور میں ہی دیر سے کھایا تھا اس لیے نہ تو اب کرن کچھ کھانا چاہ رہی تھی، نہ ان کا کچھ کھانے کا موڈ تھا۔ انہوں نے کرن کو دودھ گرم کر کے دیا جسے اس نے منہ بنا، بنا کر پیا اور خود اپنے لیے کافی بنالی تھی۔ ایک بار تو ان کا جی چاہا کہ وہ مہراں کو جا کر بلا لائیں لیکن رات کے اس وقت انہیں انیکسی کی طرف جانا مناسب نہیں لگا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید کرن کے بیڈ پر انہیں نیند نہیں آ رہی لیکن اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ سو نہیں پائے تھے۔

کرن کو zoo دکھا کر وہ ڈاکٹر حبیب سے ملے تھے۔ جب انہوں نے ڈاکٹر داؤد کا حوالہ دے کر شاہ میر تایا کے متعلق جاننا چاہا تو انہوں نے پوچھا۔

"آپ شاہ میر ملک کے متعلق کیا جاننا چاہتے ہیں؟ وہ یہاں ہی ایڈمٹ تھے، جگر کا کینسر تھا انہیں۔"

"ان کی کوئی فائل تو ہوگی ناں...... سات، آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ مشکل تو ہوگا لیکن مجھے ان کا ایڈریس چاہیے کہ ان کی فائل میں کیا ایڈریس تھا ان کے گھر کا؟"

"ایڈریس تو میں آپ کو یوں ہی بتا دیتا ہوں کہ کئی بار میں ان کی بیماری کے دوران ان کے گھر گیا

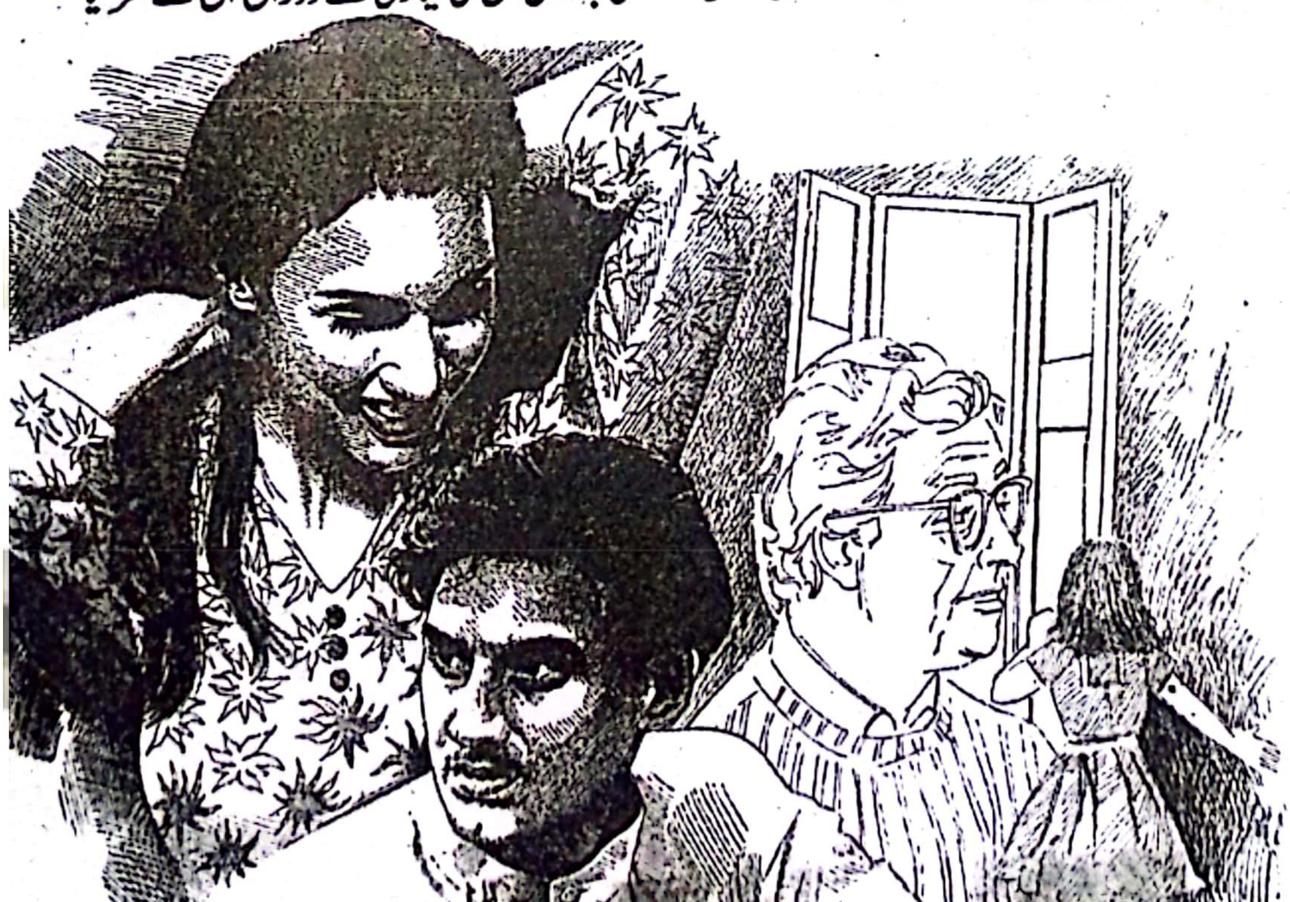

urdunovels.com

ہوں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ، میرے بھائی بھی اسی آفس میں کام کرتے تھے جہاں شاہ میر ملک کام کرتے تھے۔ وہ میرے بھائی جان سے چند سال ہی عمر میں بڑے ہوں گے لیکن بہت گہرا تعلق اور دوستی تھی ان کی...... بھائی جان تو اُن کی وفات سے ایک سال پہلے امریکا چلے گئے تھے لیکن جب وہ یہاں اس اسپتال میں ایڈمٹ ہوئے تو میری بات چیت اور ملاقات ہوتی رہتی تھی ان سے۔ لیکن آپ ان کا ایڈریس کیوں جاننا چاہتے ہیں؟''

''میں بھتیجا ہوں ان کا...... وہ میرے تایا تھے۔'' انہوں نے بتایا تو ڈاکٹر حبیب نے بے اختیار پوچھا۔

''آپ ڈاکٹر اسفند کے بھائی ہیں؟'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تیمور علی......!''

''اسفند سے داؤد کے دوست کی حیثیت سے سلام دعا تھی۔ وہ یہاں شاہ میر بھائی سے ملنے آتے رہتے تھے بلکہ ان کی ڈیڈ باڈی بھی انہوں نے ہی وصول کی تھی۔ بہت اچھے اور خوش اخلاق آدمی تھے۔ بہت دکھ ہوا تھا اُن کے حادثے کا سن کر۔'' وہ کچھ دیر اسفند علی کے متعلق گفتگو کرتے رہے اور پھر انہوں نے جو ایڈریس دیا وہ وہی تھا جو بابا نے انہیں دیا تھا۔

''میں پاکستان آیا ہوا ہوں آج کل اور ان کی فیملی سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ایڈریس جو آپ نے دیا ہے اس پر وہ موجود نہیں ہیں۔ وہ یہ گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ کرایے کا گھر تھا۔ میں نے سوچا شاید یہاں فائل میں کوئی دوسرا پتا، مطلب جہاں وہ آج کل رہ رہے ہیں، وہ درج ہو۔''

''ان کی ڈیتھ تک تو ان کی فیملی اسی گھر میں تھی۔ میں جنازے میں گیا تھا۔ شاید بعد میں کہیں اور چلے گئے ہوں...... آپ نے پڑوسیوں سے پوچھا تھا۔ کیا خبر کسی کو علم ہو کہ یہ گھر چھوڑ کر کہاں گئے ہیں؟''

''جی......!'' انہوں نے سوچا آج ایک بار پھر وہ وہاں جائیں شاید کوئی اتا پتا مل سکے۔ اور ڈاکٹر حبیب کو خدا حافظ کہہ کر وہ ایک بار پھر اس گھر کے سامنے کھڑے تھے جہاں سے ایک بار مایوس ہو کر گئے تھے۔ بیل دینے پر اس بار جو شخص باہر آیا تھا، وہ اسے پہلی بار ہی دیکھ رہے تھے۔ جب وہ پہلے آئے تھے تو ایک جوان سا لڑکا تھا۔ ''شاید یہ ادھیڑ عمر آدمی اس لڑکے کا والد ہو...... ہوسکتا ہے یہ کچھ جانتا ہو۔''

''یہاں شاہ میر صاحب کی فیملی رہتی تھی۔ میں ان کا بھتیجا ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ لوگ یہ گھر چھوڑ کر کہاں گئے ہیں؟''

''نہیں صاحب میں تو چند دن پہلے ہی اس گھر میں آیا ہوں، مجھے شاہ میر صاحب یا ان کی فیملی کے متعلق کچھ علم نہیں...... مجھ سے پہلے جلیل صاحب کے پاس تھا یہ گھر، اب وہ گلی نمبر 3 میں چلے گئے ہیں۔ آپ ان سے پتا کرلیں شاید انہیں علم ہو۔'' ادھیڑ عمر شخص واپس گھر کے اندر چلا گیا اور وہ گلی میں تنہا کھڑے تھے۔

''بابا ہم یہاں کس سے ملنے آئے ہیں...... اور کیا آپ کو ان کے گھر کا ایڈریس بھول گیا ہے؟'' کرن نے ان کا ہاتھ ہلا کر پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور واپسی کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ سامنے والے گھر کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر خاتون چادر اوڑھے باہر نکلیں۔

''ان سے پوچھ لیں بابا۔'' کرن نے نہ صرف مشورہ دیا بلکہ اس خاتون کو بلا بھی لیا۔

''آنٹی...... بات سنیں......'' خاتون ان کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

''جی بیٹا کیا بات ہے؟''

تیمور علی نے جو خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے جھجک رہے تھے ان سے شاہ میر ملک کے متعلق پوچھا تو وہ چونکیں۔

''ان کا تو انتقال ہوگیا تھا۔''

''جی جانتا ہوں...... دراصل میں باہر سے آیا ہوں۔ میرے عزیز تھے وہ۔ مجھے ان کی بیگم سے ملنا تھا۔''

''آپ اندر آجائیں بیٹا...... میں بیٹھک کا دروازہ

کھولتی ہوں، کوئی چائے پانی......؟'' خاتون کافی خوش اخلاق تھیں ورنہ پچھلی بار تو انہیں جو حضرت ملے تھے خاصے بداخلاق سے تھے۔ ایک خاتون نے بھی بڑی رکھائی سے جواب دیا تھا۔

''نہیں آنٹی بہت شکریہ...... مجھے بس یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ لوگ یہ گھر چھوڑ کر کہاں گئے ہیں کیا آپ کو کچھ معلوم ہے؟''

''نہیں......'' خاتون نے نفی میں سر ہلایا۔

''بس اتنا جانتی ہوں کہ ان کے رشتے کے کوئی بھائی جو شاہ میر بھائی کی وفات کا سن کر آئے ہوئے تھے انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔''

''کیا یہاں محلے میں کسی اور سے معلوم ہوسکتا ہے ان کے بھائی کے متعلق...... کیا خبر انہوں نے کسی سے ذکر کیا ہو۔'' ایک امید سی بندھی تھی کہ شاید پتا چل جائے۔

''نہیں......'' خاتون نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

''صبا بہن کا ہمارے علاوہ کسی اور کے ہاں آنا جانا نہیں تھا۔ سلام دعا کی الگ بات ہے۔ وہ اپنے شوہر کی بیماری کی وجہ سے پریشان اور مصروف رہتی تھیں۔ اسپتالوں کے چکر...... شاہ میر بھائی کی دیکھ بھال...... بیٹی پڑھتی تھی چھوٹی تھی تو ساری ذمے داریاں خود ہی اٹھائی ہوئی تھیں۔ ہمارے محلے میں جب انہوں نے گھر کرائے پر لیا تو شاہ میر بھائی بیمار ہی تھے۔ ہمارا گھر چونکہ بالکل سامنے تھا تو آنا جانا ہوگیا۔ وہ مجھے بالکل اپنی سگی بہن جیسی لگتی تھیں۔ بہت گہرا تعلق بن گیا تھا۔''

''اور اتنے گہرے تعلق کے باوجود انہوں نے آپ کو کچھ نہیں بتایا کہ کہاں جارہی ہیں......؟ کیا کبھی انہوں نے اپنے اس بھائی کا ذکر آپ سے نہیں کیا جس کے ساتھ وہ گئی تھیں۔'' تیمور علی کو حیرت ہوئی تھی۔

''میں نے بتایا تو ہے کہ ان کے شوہر بیمار تھے اور جن حالات سے وہ گزر رہی تھیں ان میں انسان اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں کرتا، ہماری گفتگو ان کے شوہر کی بیماری، اخراجات اور بیٹی کے مستقبل کے حوالے سے ہی ہوتی تھی۔ انہوں نے کبھی اپنے کسی عزیز رشتے دار کا ذکر نہیں کیا تھا۔ البتہ شاہ میر بھائی جب اسپتال میں تھے تو انہوں نے میرے بھائی صاحب کو اپنے ان کزن کا فون نمبر دیا تھا کہ خدانخواستہ کچھ ہوجائے تو یہاں اطلاع کردیں۔ ڈاکٹروں نے بتادیا تھا انہیں کہ یہ بس کچھ دنوں ہی کے مہمان ہیں تو اس خیال سے دیا ہوگا کہ کوئی تو اپنا ہو جنازے کو کندھا دینے کے لیے اور......''

''جی، جی پلیز آپ کے بھائی صاحب کدھر ہیں، ان سے ملوادیجیے...... ان کے پاس نمبر تو ہوگا ناں......؟'' انہوں نے بے چینی سے ان کی بات کاٹی تھی۔

''نہیں...... صوفی صاحب کا تو شاہ میر بھائی کی وفات کے صرف پندرہ دن بعد ہی اچانک ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ بھائی صاحب کو ہم سب صوفی صاحب ہی کہتے تھے۔''

''اوہ......'' دل میں امید کی کرن جل کر بجھی تھی۔

''آپ کو انہوں نے جاتے ہوئے بھی کچھ نہیں بتایا۔ آپ کی بہن کی طرح تھیں وہ...... جاتے ہوئے ملی تو ہوں گی آپ سے۔'' وہ لحہ بھر کے لیے مشکوک سا ہوئے تھے۔

''شاہ میر بھائی کی وفات کے چوتھے دن مالک مکان نے ان کا سامان باہر پھینکنے کی دھمکی دی۔ چار ماہ یا پتا نہیں کچھ زیادہ کا کرایہ دینا تھا انہوں نے، بہت خبیث آدمی تھا وہ۔ نیت خراب تھی اس کی تو بس فوراً ہی ان کے بھائی کرایہ ادا کرکے انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے، زیادہ دن یہاں رہ نہیں سکتے تھے اور وہ بیچاری اکیلی عورت جوان بچی کے ساتھ کیسے رہتی...... میں ملنے گئی تھی۔ خود سامان باندھا تھا۔ صبا نے روتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کے بھائی نے صوفی صاحب کو اپنے گھر کا ایڈریس وغیرہ سمجھا دیا ہے اگر کوئی ان کے متعلق پوچھے تو اسے بتادیں۔ لیکن صوفی صاحب خود ہی چلے گئے۔ شاہ میر بھائی کے بھائی ایک دفعہ آئے تھے ان کا پتا کرنے، اس روز صوفی صاحب کو گزرے تین دن ہوگئے تھے پھر بھی ان کی ڈائری سے میرے بھتیجے نے فون نمبر تلاش کیے تھے۔ چھ سات اجنبی نام

digest novels lovers group
UUNovels.com

تھے۔ ان سب کے نمبر وہ صاحب لے گئے تھے لکھ کر ...... پھر پتا نہیں انہیں وہ لوگ ملے یا نہیں وہ بھی صبا کے بھائی کا نام وغیرہ نہیں جانتے تھے غالباً شاہ میر بھائی نے گھر والوں کی مرضی کے بغیر شادی کی ہوگی صبا سے تب ہی......" طویل گفتگو کر کے آخر میں ان خاتون نے انسانی فطرت کے ازلی تجسس کے تحت بات ختم کی تھی۔ وہ بغیر ان کی بات کا جواب دیے کرن کا ہاتھ پکڑے مڑے تو انتہائی مایوسی ان پر غالب آ چکی تھی۔

"بیٹا کھانا کھا کر چلے جانا۔"

"نہیں آنٹی بہت شکریہ لیکن ایک خیال ذہن میں آیا ہے کہ آپ کا اتنا تعلق تھا ان سے آپ کے پاس تو چلو ان کا اتا پتا نہیں تھا لیکن انہوں نے بھی اتنے عرصے میں آپ کو کبھی فون نہیں کیا، ملنے نہیں آئیں......؟ جن سے اتنا تعلق ہو اُن سے اس طرح رابطے ٹوٹتے تو نہیں۔"

"صحیح کہہ رہے بیٹا...... ہمارے گھر فون نہیں ہے، ورنہ وہ فون ضرور کرتیں...... جہاں تک یہاں آ کر ملنے کی بات ہے تو پتا نہیں وہاں کن حالات میں رہ رہی ہوں...... کسی دوسرے کے گھر رہنا آسان نہیں ہوتا...... بھلے وہ آپ کا کتنا ہی اپنا کیوں نہ ہو......" ان کی آنکھوں میں نمی سی پھیلی...... وہ خود بھی تو بیوہ ہو کر بھائی کے گھر آئی تھیں۔

"میری بات بری لگی ہو تو معذرت خواہ ہوں لیکن آپ سے ایک درخواست ہے کہ اگر کبھی وہ آ جائیں آپ سے ملنے تو یہ میرا فون نمبر انہیں دیجیے گا۔ ابھی تقریباً چھ ماہ تک میں پاکستان میں ہوں...... اس کارڈ پر میرے دونوں نمبر ہیں، پاکستان کا بھی اور باہر کا بھی......"

احتیاطاً لاہور آنے سے پہلے انہوں نے اپنے دو تین وزیٹنگ کارڈ رکھ لیے تھے کہ شاہ میر تایا کے جاننے والوں سے اگر ملاقات ہوئی تو انہیں دے آئیں گے۔

"نہیں...... نہیں بیٹا معذرت کی کوئی بات نہیں، مجھے آپ کی کوئی بات بری نہیں لگی۔" انہوں نے کارڈ پکڑ لیا۔

"خود بیوہ ہوں بھائی کے گھر رہتی ہوں تو صبا کی مجبوری سمجھ سکتی ہوں کہ اپنی کسی خواہش کا اظہار کتنا مشکل ہوتا ہے۔"

"جی......"

تیمور ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کر کے گلی سے نکل آئے تھے۔ ایک بار پھر وہ تاریک گلی میں کھڑے تھے۔ کرن مسلسل کوئی نہ کوئی سوال کر رہی تھی جس سے ان کا ارتکاز بار، بار ٹوٹ جاتا۔ وہ سوچنا چاہتے تھے کہ اب کیا کریں۔ بابا نے ان کے دو تین دوستوں کے ایڈریس دیے تھے کہ شاید ان کو کچھ علم ہو۔ ان میں سے دو تو ملک سے باہر سیٹل ہو گئے تھے۔ ایک دوست کا کئی سالوں سے ان سے رابطہ نہیں تھا۔ ایک دوست کے متعلق ان کے گھر سے معلوم ہوا تھا کہ وہ ان دنوں کراچی گئے ہوئے ہیں تو کیوں نہ ان سے بھی ملتا جاؤں......اب تو گھر پر مل جائیں گے۔ پچھلی بار دو تین بار معلوم کرنے کے بعد کہ وہ کراچی سے آئے ہیں یا نہیں اور پھر انہوں نے اپنی مصروفیت میں الجھ کر بعد میں معلوم نہیں کیا تھا۔ یہ ان کی کوتاہی تھی۔ فردوس مارکیٹ کے آس پاس ہی کہیں ان کا گھر تھا۔ انہوں نے سوچا کہ وہ لبرٹی سے یا فردوس مارکیٹ سے کرن کے لیے کچھ شاپنگ بھی کر لیں گے اور شاہ میر تایا کے دوست سے بھی مل لیں گے۔ شاید کوئی مزید سراغ مل جائے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ شادی کے کچھ عرصے بعد تک تو ان کا رابطہ رہا تھا پھر ٹوٹ گیا تھا۔ درمیان میں کچھ عرصے کے لیے وہ... ابوظہبی چلے گئے تھے۔ وہاں سے ایک آدھ بار فون پر بات ہوئی تھی واپس آ کر ملنے کے لیے گئے تو شاہ میر وہ گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ انہیں تو شاہ میر کی وفات کا بھی علم نہیں تھا۔ تاہم انہوں نے اتنا بتایا تھا کہ شاہ میر کی شادی میں ان کے رشتے داروں میں سے صرف تنویر علی شریک ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے انہیں ان کے سسرالی عزیزوں کے متعلق کچھ علم ہو......

"تنویر چاچو" انہیں ایک دم خیال آیا، انہوں نے کلاک پر نظر ڈالی۔ ایک بجنے والا تھا اور اس وقت انہیں فون

urdunovels.com

کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بہرحال صبح تک انہیں صبر کرنا ہی تھا۔ جب وہ گھر پہنچے تو ساڑھے دس بج رہے تھے تب شاید چاچو جاگ رہے ہوتے لیکن انہیں اس وقت کرن کو سلانے کی فکر میں خیال ہی نہیں رہا اور اب دل چاہ رہا تھا کہ ابھی چاچو سے بات کرلیں۔ تنویر چاچو بہت درویش منش سے انسان تھے۔ انہیں اپنی مٹی سے محبت تھی اور زراعت کی اعلیٰ ڈگری باہر سے لی تھی۔ زیادہ تر وہ گاؤں میں رہتے تھے لیکن باہر بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کا اکلوتا بیٹا جسے انہوں نے اڈاپٹ کیا تھا۔ ان دنوں امریکا کی ریاست مشی گن میں تھا اور آج کل معدے اور جگر کے شعبے میں اسپیشلائزیشن کررہا تھا۔ اس کی زیادہ تر ایجوکیشن یوکے اور امریکا میں ہی ہوئی تھی۔ تنویر چاچو اور اسما چچی سال میں ایک دو بار اس کے پاس جاتے تھے۔ ابھی اس روز جو وہ گاؤں گئے تھے تو ان کی ملاقات تنویر چاچو سے نہیں ہوسکی تھی کہ اس کے جانے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ فیصل آباد کچھ بیج وغیرہ لینے چلے گئے تھے۔ ورنہ تنویر چاچو سے مل کر ان سے باتیں کرکے انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ انہیں بالکل اپنے بابا جیسے لگتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ وہ تنویر چاچو سے کہیں گے کہ وہ دادا جان کو سمجھائیں کہ سبین والے سلسلے کو ختم کردیں۔ خواہ مخواہ انہوں نے سبین کا دماغ بھی خراب کردیا تھا۔ انہیں اس سے چڑ سی ہورہی تھی۔ راستے میں کئی بار اس کا فون آیا تھا۔ تنگ آکر ایک بار انہوں نے اٹینڈ کرلیا۔ تب وہ چڑیا گھر میں تھے۔ ان کے ہیلو کرتے ہی وہ شروع ہوگئی تھی۔

"حد کرتے ہیں تیمور آپ بھی...... یعنی لاہور چلے گئے اور بتایا تک نہیں۔ میں بھی بچوں کو لے کر ساتھ چلی جاتی......" وہ اپنے بھتیجوں کا کہہ رہی تھی۔ "کب سے ہم پروگرام بنارہے تھے کہ لاہور جائیں گے اور کرن کتنا خوش ہوتی بچوں کے ساتھ اب تو بیچاری بور ہورہی ہوگی۔"

"بالکل بھی بور نہیں ہورہی خوب انجوائے کررہی ہے۔ اور تم پلیز اس کے متعلق پریشان ہونا چھوڑ دو......" سنجیدگی سے کہتے ہوئے انہوں نے فون بند کردیا تھا اور اس کے بعد بھی کئی بار اس کی کال آئی لیکن ہر بار نمبر دیکھ کر اگنور کیا۔

"جب میں نے سبین سے شادی کرنی ہی نہیں ہے تو پھر خواہ مخواہ اسے آس دلانے کا فائدہ...... میں تنویر چاچو سے کہوں گا کہ دادا جان سے دوٹوک بات کریں کہ اگر شاہ میر تایا کی فیملی سے میرا رابطہ نہیں بھی ہوتا تو بھی میں سبین سے شادی نہیں کروں گا۔ پہلے تو سبین ایسی نہیں تھی پر اس بار پتا نہیں کیوں چڑ سی ہورہی ہے۔ یقیناً دادا جان نے ہی اس کے دماغ میں یہ خناس بھرا ہوگا۔" انہوں نے سوچا۔

"وہ شاہ میر تایا کو پسند نہیں کرتے تو یہ کیسے گوارا کرسکتے ہیں کہ ان کا پوتا شاہ میر کی بیٹی سے شادی کرلے۔" انہوں نے تو اگرچہ کسی سے ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ پاکستان کس مقصد سے آئے ہیں۔ یہ بات تو صرف ان کے اور بابا کے درمیان تھی۔ اسفند کو بھی اس کا علم تھا۔ انہوں نے بابا سے وعدہ کیا تھا۔ پھر پتا نہیں دادا جان کو کیسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ یہاں پاکستان کیوں آئے ہیں۔ "شاید کبھی بابا نے ان سے ذکر کیا ہو سرسری سا۔ خیر تنویر چاچو کو تو میں خود ساری بات بتادوں گا کہ مجھے بابا سے کیا ہوا عہد نبھانا ہے اور اگر نہ نبھا سکا تو واپس چلا جاؤں گا......" اس نے کبھی شاہ میر تایا کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ ان سے ملا تھا لیکن تصویریں تھیں ان کی اور بابا کی اکٹھی۔ اسکول اور کالج لائف کی اور بابا اکثر ان کا ذکر کرتے رہتے۔ انہیں اپنے بڑے بھائی سے بہت محبت تھی وہ ان کا ذکر کرتے ہوئے اکثر بے حد اداس ہوجاتے۔

"ابا جان نے شاہ میر بھائی سے بہت زیادتی کی۔ بہت ظلم کیا۔" یہ ان کا مخصوص جملہ تھا جو وہ ان کا ذکر کرتے ہوئے ضرور بولتے تھے۔

"پسند کی شادی کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔ صبا بھابی ان کی کلاس فیلو تھیں...... دونوں یونیورسٹی میں ایک ہی ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ شاہ میر بھائی کو ان کی سادگی اور حیا نے اٹریکٹ کیا تو انہوں نے اماں جان

digest novels lovers group

سے ذکر کیا۔ اماں جان کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اماں جان بہت نرم مزاج کی اور اپنی اولاد کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھتی تھیں۔ جبکہ دادا جان کا مزاج سخت تھا اور وہ ہمیشہ اپنی ہی منواتے تھے۔'' ایک بار تیمور کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا۔

''شاہ میر بھائی نے اماں جان سے بات کرنے کے بعد صبا بھابی سے بات کی تھی۔ ورنہ ان کا خیال تھا کہ اگر اماں جان کو اعتراض ہوا تو وہ صبا بھابی سے بات نہیں کریں گے۔ اس وقت تک انہوں نے بھابی سے پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اماں جان کی مرضی جاننے کے بعد ہی ان کے درمیان اس طرح کی بات چیت شروع ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ صبا اور وہ یونیورسٹی سے فارغ ہو جائیں تو وہ اماں جان کو ان کے گھر رشتے کے لیے بھیجیں گے...... ابا جان سے وہ تھوڑا ڈرتے تھے اس لیے دل کی ہر بات اماں جان سے ہی کہتے تھے۔ جبکہ میں اور تنویر، ابا جان سے بھی بے تکلفی سے بات کر لیتے تھے۔ تھوڑی بہت ضد کر کے اپنی بات منوا بھی لیتے تھے لیکن شاہ میر بھائی نہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اِدھر ان کی پڑھائی ختم ہوئی اُدھر اماں جان چند دن بیمار رہ کر چل بسیں...... ایک سال تو اس صدمے میں ہی گزر گیا۔ میرے دل میں کچھ تکلیف تھی۔ ہارٹ کا مسئلہ پیدائشی تھا۔ میرا یو کے میں ایڈمشن ہو چکا تھا۔ اور مجھے وہاں اپنا علاج بھی کروانا تھا۔ اماں جان کی اچانک وفات کی وجہ سے میں چھ، سات ماہ لیٹ ہو گیا تھا۔ ان چھ، سات ماہ میں شاہ میر بھائی سائے کی طرح میرے ساتھ، ساتھ رہے۔ وہ تو بچپن سے ہی میرا سایہ بنے ہوئے تھے۔ گو ہماری عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا لیکن وہ میرا اس طرح خیال رکھتے تھے جیسے مجھ سے بہت بڑے ہوں۔ ہماری پھوپی جو حویلی میں ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں اکثر شاہ میر بھائی کو میری دوسری اماں کہتی تھیں۔ اور خود میں بھی تو ہر وقت ان کے آگے پیچھے ہی پھرتا رہتا تھا۔ تنویر اور دونوں بہنوں سے میں اتنا قریب نہیں تھا جتنا شاہ میر بھائی سے تھا۔ تنویر سب سے چھوٹا تھا تو وہ بہنوں کے زیادہ قریب تھا۔ وقت کے ساتھ، ساتھ ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا گیا۔ ایک وقت تھا جب میں انہیں شاہ میر کہہ کر بلانے لگا تھا۔ بھائی کا لاحقہ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ اماں جان نے مرنے سے پہلے مجھ سے اور شاہ میر سے وعدہ لیا تھا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت کریں گے جتنی اب کرتے ہیں۔ اتنا ہی خیال رکھیں گے جتنا اب...... کبھی ایک دوسرے سے حسد نہیں کریں گے...... ایک دوسرے کا برا نہیں چاہیں گے۔'' ''شاہو، میرے بچے مجھ سے اگر تمہاری کوئی حق تلفی ہوگئی ہو تو مجھے معاف کر دینا کہ تیری ماں بہت مجبور تھی۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ اماں جان، آپ تو ساری دنیا کی ماؤں سے زیادہ اچھی ماں ہیں۔'' شاہ میر بھائی رونے لگے تھے۔ ''مجھے گناہ گار مت کریں ایسا مت کہیں۔'' تب اماں جان نے میرا ہاتھ پکڑا تھا اور کہا تھا۔

''میرو......'' وہ ہم دونوں کو جب بہت پیار آتا تو یوں ہی کہہ کر بلاتی تھیں۔ مجھے میرو...... اور شاہ میر کو شاہو...... اور تنویر کو ویرو...... ''میرو کبھی بھی اپنے بھائی کا ساتھ نہ چھوڑنا ساری دنیا اس کا ساتھ چھوڑ دے لیکن تم نہیں...... تم ہر مشکل میں اس کے ساتھ کھڑے رہنا۔ کبھی میرے شاہو کو اکیلا مت کرنا۔''

''اماں جان پتا نہیں آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے ناں ہم دونوں ایک دوسرے کی جان ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے مر سکتے ہیں۔'' میں بھی شاہ میر کی طرح ان کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگا تھا۔

''نہ روؤ نہیں میرے بچے......'' وہ مسکرائیں۔

''اور تم دونوں میری بات دھیان سے سنو جو بات میں تمہیں بتانے لگی ہوں وہ......'' اور تب ہی دادا جان، ڈاکٹر سے باتیں کرتے ہوئے اندر آ گئے تھے۔ اور شاہ میر نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اور ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دادا جان کے اشارے پر کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے مڑ کر اماں جان کو دیکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ہمیں دیکھ رہی

تھیں ان کی آنکھوں میں روشنی اور چمک سی تھی اور چہرہ بہت پرسکون تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے والا اضطراب نظر نہیں آتا تھا۔ ہم باہر آکر صحن میں اماں جان کے تخت پر بیٹھ گئے تھے۔ جہاں تنویر دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا رو رہا تھا۔ شاہ میر بھائی نے اسے گلے لگالیا۔

”میری جان، میرے ویرو کچھ نہیں ہو گا...... ہماری اماں جان ٹھیک ہو جائیں گی۔ چلو ہم تینوں نفل پڑھ کر اللہ سے دعا کرتے ہیں۔“ ہم دعا کرتے رہے لیکن وہ تو ہمارے کمرے سے باہر نکلتے ہی دعاؤں کی حد سے دور جا چکی تھیں۔ بس آدھے گھنٹے بعد یا شاید ایک گھنٹے بعد۔

اماں جان کے بعد میں اور شاہ میر، اماں جان کی ڈھیروں باتیں کرتے رہتے۔ چھ سات ماہ کے ہر دن ہم نے اندازے لگائے کہ اماں جان اس وقت ہمیں کیا بات بتانے لگی تھیں۔ اور پتا نہیں سکی تھیں اندازہ لگاتے اور پھر رد کر دیتے۔ جس روز میں لندن جا رہا تھا شاہ میر بہت روئے تھے۔

”میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا...... اماں جان نے تمہیں میرے حوالے کیا تھا۔ نہ جاؤ میرو...... میں کوشش کر رہا ہوں ناں میرا ویزا لگ جائے گا ان شاء اللہ۔ پھر دونوں بھائی اکٹھے جائیں گے۔“ لیکن میری ڈاکٹر کے ساتھ اپائمنٹ تھی...... بارہ سال کی عمر سے میں ہر چھ ماہ بعد چیک اپ کرانے لندن جاتا تھا۔ تب ابا جان نے انہیں ڈانٹ دیا تھا یہ کہہ کر کہ ”میرو بچہ نہیں ہے بیس سال کا ہے اور تم اس کی ماں نہیں ہو......“ اور شاہ میر بالکل چپ کر گئے تھے۔ پتا نہیں ابا جان کو اتنا غصہ کیوں آگیا تھا۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ بلکہ اماں جان کے بعد اکثر وہ شاہ میر کو بلاوجہ ہی ڈانٹ دیتے تھے۔

”اماں جان کے اس طرح اچانک چلے جانے سے شاید وہ ٹینشن میں ہیں......“ یہ شاہ میر کا اور میرا خیال تھا۔ اماں جان کی پہلی برسی کے بعد شاہ میر نے پھپو کے ذریعے ابا جان سے صبا بھابی کے متعلق بات کی۔ صبا بھابی کے والد ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ متوسط

غزل

آج بخت رسا نے حد کر دی
یعنی تیری عطا نے حد کر دی

تیری خوشبو اُڑا کے لے آئی
آج موجِ صبا نے حد کر دی

سب ستارے بھی ہو گئے مدھم
آج اس کی ضیا نے حد کر دی

ہم نے اک بات کی جدائی کی
اور اس بے وفا نے حد کر دی

تیری تصویر آنکھ میں پانی
درد چاہت وفا نے حد کر دی

شاعر: ارشد ملک

انتخاب: روبینہ حیات مغل، کراچی

قطعہ

دل کی یہ سنسان حویلی
جس پر کالے سائے ہیں
آنکھوں کی دہلیز پہ فری
غم کے بادل چھائے ہیں

کاوش: فریدہ فری، لاہور

UUNovels.com

خوشحال طبقے سے ان کا تعلق تھا۔ صبا بھابی ان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بہت زیادہ دولت مند نہیں تھے۔ لیکن معزز خاندان تھا، پر ابا جان نے انکار کر دیا۔ وہ اپنے خاندان اور برادری سے باہر رشتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ شاہ میر پر بہت گرجے برسے تھے کہ ”اگر خاندان سے باہر ہی کرنا تھا تو برابری کے لوگ تو ہوتے۔ پانچ مرلے کا مکان...... سرکاری پنشن بس......“ شاہ میر نے بہت کوشش کی کہ ابا جان مان جائیں لیکن ابا جان کسی صورت راضی نہیں ہوئے تو پھپو نے شاہ میر کو ہی سمجھایا کہ وہ ہی صبا سے شادی کی ضد

چھوڑ دے لیکن انہوں نے کہا کہ انہوں نے ، اماں جان کی اجازت کے بعد صبا سے بات کی تھی اگر انہیں پتا ہوتا کہ ابا جان نہیں مانیں گے تو وہ کبھی صبا سے اس کا اظہار نہیں کرتے لیکن اب وہ اپنی زبان سے نہیں پھریں گے چاہے کچھ بھی ہو۔ تب ابا جان نے کہا۔

''چاہے تم گھر چھوڑ کر چلے جاؤ میں اپنے گھر میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا......'' اور شاہ میر بھائی نے گھر چھوڑ دیا۔ مجھے ان سب حالات کا علم دو سال بعد ہوا جب میں اپنی گریجویشن مکمل کر کے واپس آیا۔ گھر میں سے کسی نے تنویر نے نہ دونوں بہنوں نے اور نہ ہی ابا جان نے کچھ بتایا تھا حالانکہ ہر ماہ ابا جان فون کرتے تھے۔ شاہ میر کے خط بھی آتے تھے اور تین چار ماہ بعد وہ فون بھی کر لیتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لاہور میں جاب کر رہے ہیں...... میری نظروں نے ائرپورٹ پر انہیں ڈھونڈا تھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب میں بتاؤں گا کہ وہاں ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا ہے کہ اب میرا دل بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ بس احتیاطاً سال میں ایک بار چیک اپ کے لیے آجایا کروں تو وہ کتنے خوش ہوں گے کہ میری اس بیماری کی وجہ سے وہ میرے لیے بہت پریشان رہتے تھے...... میں ابا جان سے لڑا بھی...... بہنوں اور تنویر سے بھی جھگڑا کہ انہوں نے کیوں شاہ میر کو جانے دیا کیوں نہ روک لیا۔ مجھے کیوں نہیں کچھ بتایا۔ میں آجاتا لندن سے...... لیکن اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شاہ میر نے تو میری پریشانی کے خیال سے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اور باقی لوگوں کو ابا جان نے منع کر دیا تھا۔ میں دوسرے دن ہی لاہور اس ایڈریس پر پہنچ گیا جس ایڈریس پر میں خط لکھتا تھا لیکن شاہ میر نہیں تھے وہاں...... ان کے مالک مکان سے پتا چلا کہ وہ کراچی چلے گئے ہیں۔ یہاں ان کی جاب ختم ہوگئی تھی تو چند دن پہلے ہی گئے ہیں۔ لیکن کراچی میں وہ کہاں ہیں؟ کس جگہ، اس کا علم نہیں تھا۔ کہاں اتنے بڑے شہر میں انہیں تلاش کرتا...... پھر بھی میں کراچی وقتاً فوقتاً جاتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور مجھ سے رابطہ کریں گے۔ شاید حویلی میں کسی روز فون کر کے میرا پوچھیں۔ پہلے... سرپرائز کے چکر میں انہیں میں نے نہیں بتایا تھا کہ میں آرہا ہوں...... پھر تنویر اور ابا جان کو جب آنے کا بتایا تو تنویر سے کہا تھا کہ جس روز مجھے آنا ہو اسی روز شاہ میر کو بتائے، وہ لاہور میں تھے تو ظاہر ہے ابا جان اور تنویر لاہور میں انہی کے پاس ٹھہرتے...... لیکن مجھے پاکستان آئے چار سال گزر گئے۔ مجھے ان کا پتا نہ چلا۔ انہوں نے کبھی حویلی بھی فون نہیں کیا۔ پاکستان آنے کے فوراً بعد میری شادی ہوگئی تھی اور میری شادی کے دو سال بعد تنویر کی بھی ابا جان نے شادی کر دی، اگرچہ تنویر ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ابا جان کے دل میں نہ جانے کیا ڈر تھا کہ انہوں نے اس کی شادی تعلیم کے لیے باہر جانے سے پہلے ہی کر دی تھی۔ ہم دونوں کی شادیاں خاندان میں ہی ہوئیں۔ تنویر کی بیوی ہمارے چچا کی بیٹی تھی جو حیات نہیں تھے۔ ایک ہی بیٹی تھی ان کی، تنویر کو اس سے شادی کرنے سے انکار نہیں تھا بلکہ کسی حد تک دونوں میں انڈرسٹینڈنگ بھی تھی لیکن وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن شاہ میر ... کا انجام اس کے سامنے تھا اس لیے اس نے ضد نہیں کی...... اور شادی کر کے مزید تعلیم کے لیے چلا گیا۔ شاہ میر ... اور اماں جان کے بعد یوں بھی میرا دل حویلی میں نہیں لگتا تھا اس لیے میں گوجرانوالہ سیٹل ہوگیا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ اور یہ گوجرانوالہ آنے کے دو سال بعد کی بات ہے میں معمول کے چیک اپ کے لیے لندن گیا ہوا تھا کہ تنویر کا فون آیا۔

''ازمیر بھائی...... شاہ میر بھائی کل اچانک حویلی آگئے ہیں۔'' خوشی سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''انہوں نے ابا جان کے پاؤں پکڑ کر ان سے معافی مانگ لی ہے۔''

''اور کیا ابا جان نے معاف کر دیا انہیں؟''

''پتا نہیں لیکن انہوں نے ان کے بیٹے کو گود میں

digest novels lovers group
urdunovels.com

بٹھا کر بہت پیار کیا ہے۔ ان کا ایک بیٹا ہے تقریباً تین سال کا اور ایک چند ماہ کی پیاری سی بیٹی بھی ہے۔''

اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں پھر انہوں نے مجھ سے بات کی تو میں بہت ناراض ہوا کہ انہوں نے مجھے اپنے کراچی جانے کا نہیں بتایا اور نہ ہی وہاں کا پتا بتایا میں نے کتنا ڈھونڈا انہیں.....تو وہ بہت حیران ہوئے کہ ''انہوں نے کراچی سے کتنے ہی خط لکھے تھے مجھے اور میں نے کسی خط کا جواب نہیں دیا.....اور فون پر بھی کوئی اور بولتا تھا تو میں نے سمجھا کہ شاید ابا جان نے تمہیں منع کر دیا ہے لیکن میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔ ہر روز تمہاری صحت و زندگی کی دعا کی میرو.....'' ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

ہوا یوں تھا کہ میں تو پاکستان آ گیا تھا اور ان کے خط میرے آنے کے بعد وہاں جاتے رہے تھے۔

انہوں نے بتایا تھا کہ ابا جان نے زبان سے انہیں معاف تو نہیں کیا لیکن جانے کے لیے بھی نہیں کہا۔

جب سب نے چھوٹی کی شادی میں شرکت کے لیے روکا تو کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ راضی ہو جائیں گے، یہ جو میرا بیٹا ہے ناں امن یہ ہر وقت دادا کی گود میں گھسا رہتا ہے۔ بہت باتونی ہے۔ ٹوٹی پھوٹی باتیں کرتا ہے، دیکھنا یہ دادا کا دل نرم کر دے گا۔'' چھوٹی اگرچہ تنویر سے تقریباً سال ڈیڑھ سال بڑی تھی لیکن تنویر کی شادی پہلے ہوئی تھی اور اس کی اب ہو رہی تھی۔

''میں چیک اپ کراتے ہی آ جاؤں گا.....یوں بھی چھوٹی کی شادی سے پہلے مجھے آنا ہی تھا۔''

اس روز ہم نے دو، تین بار فون پر بات کی۔ ہم روئے بھی ایک دوسرے سے ناراض بھی ہوئے اور اماں جان سے کیا ہوا وعدہ دُہرایا بھی، ہنسے بھی..... اپنے، اپنے بچوں کے متعلق بھی بتایا۔ وہ چند دن جو میں نے وہاں گزارے بہت مشکل تھے۔ لاہور سے گوجرانوالہ آ کر بغیر رکے تم لوگوں کو لے کر حویلی پہنچا تھا لیکن شادی کے ہنگاموں کے باوجود گھر میں ایک افسردہ سی خاموشی تھی۔

''شاہ میر کہاں ہیں؟'' میں نے تنویر سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔

''چلے گئے۔''

''کیوں چلے گئے.....کیا ابا جان نے.....؟'' میرا دل جیسے غم سے پھٹ رہا تھا۔ اتنے سالوں بعد میں ان سے ملنے کی امید لے کر آ رہا تھا اور.....

''نہیں خود چلے گئے۔'' تنویر نے بتایا۔ ''منتوں مرادوں کے بعد شادی کے کئی سال بعد پیدا ہونے والا بیٹا گنوا کر۔''

بابا کی سنائی یہ وہ کہانی تھی جو ہر چند ماہ بعد دُہرائی جاتی تھی۔ اور رات کے اس پہر..... بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے انہوں نے دل ہی دل میں اسے دُہرا ڈالا تھا۔ لیکن نیند اب بھی آنکھوں سے دور تھی.....وہ اور اسفند چھوٹی عمر سے ہی شاہ میر تایا کے ملنے کی دعا مانگا کرتے تھے کہ بغیر ان سے ملے انہیں دیکھے، بابا نے ان کے دل میں ان کی محبت پیدا کر دی تھی۔ وہ جہاں کہیں جاتے راہ چلتے لوگوں میں شاہ میر کی شباہت ڈھونڈتے جو تصویروں میں دیکھی تھی۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو شاہ میر تایا کو ڈھونڈ کر بابا کے سامنے لا کھڑا کرتے.....ازمیر علی کا دل پاکستان سے اچاٹ ہو گیا تھا اس لیے وہ باہر چلے گئے تھے۔ جب بھی پاکستان آتے تو شاہ میر کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے لیکن انہوں نے پتا نہیں خود کو کہاں چھپا لیا تھا کہ ملتے ہی نہیں تھے۔ وہ شاید سب سے ہی خفا ہو گئے تھے.....تنویر نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اپنے بیٹے کے بغیر نہیں جائیں گے اسے ڈھونڈ کر ساتھ ہی لے کر جائیں گے لیکن پھر اس رات ابا جان سے نہ جانے ان کی کیا بات ہوئی کہ وہ صبح خاموشی سے کسی سے ملے بغیر حویلی سے چلے گئے۔ لیکن کسی نہ کسی ذریعے سے وہ اپنے بیٹے کے متعلق پتا کرواتے رہتے تھے۔ لیکن تنویر چاچو بھی کبھی سراغ نہ لگا سکے تھے اور اب جاتے جاتے بابا انہیں وعدے کی زنجیروں میں باندھ گئے تھے۔ شاہ میر ...تایا کی بیوی اور بیٹی کو ڈھونڈنے کا وعدہ اور پھر اگر

UrduNovels.com

ان کی بیٹی کی اب تک شادی نہ ہوئی ہو تو اس سے شادی کرنے کا وعدہ...... اور اب جب دو سالوں بعد انہیں لگ رہا تھا کہ وہ یہ وعدہ نہیں نبھا پائیں گے تو یہ ایک چھوٹی سی امید کی کرن نظر آئی تھی۔

اگر تنویر چاچو کو صبا آنٹی کے کزن کے متعلق علم ہوا تو پھر؟ اور وہ شاہ میر تایا کی بیٹی نہ جانے کیسی ہوگی۔ اسفند بھائی نے انہیں بتایا تھا کہ ''وہ بہت پیاری اور انوسنٹ سی ہے۔ بہت مدھم اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والی...... میری تو وہ بھابی نہیں بہن ہوگی...... میں نے تو اسے دیکھتے ہی سوچ لیا تھا......'' اور کتنے دنوں بعد آج پھر وہ اسے سوچ رہے تھے...... ایک بار پھر لیٹ کر انہوں نے آنکھیں موند لی تھیں...... اور پھر نہ جانے کب اس کے متعلق سوچتے ہوئے وہ سو گئے تھے۔

صبح ان کی آنکھ کچھ دیر سے کھلی تھی...... جلدی، جلدی تیار ہو کر باہر آئے تو مہراں دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ انہوں نے لاؤنج میں آ کر دروازہ کھولا تو مہراں، کرن کے کمرے کی طرف بڑھی۔

''نہیں، آج اسے سونے دو تھکی ہوئی ہے۔ اسکول نہیں جائے گی۔ رفیق بھائی کے آنے تک تم مجھے چائے بنا دو...... آج شاید انہیں بھی دیر ہو گئی ہے۔''

اور مہراں کچن کی طرف بڑھ گئی تو وہ وہاں لاؤنج میں ہی صوفے پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگے جو مہراں باہر سے اٹھا کر لائی تھی اور ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ تب ہی ان کے فون کی بیل ہوئی تو نمبر دیکھ کر جھنجلائے لیکن فون آن کیا۔

''اب صبح صبح کیا مصیبت پڑ گئی ہے تمہیں؟''

''بس پوچھنا تھا رات کس وقت واپسی ہوئی...... کرن ٹھیک ہے؟''

''ساڑھے دس بجے اور اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہے اور سو رہی ہے۔ آج اسے اسکول نہیں جانا۔''

''تو آپ بھی نہ جائیں آج چھٹی کر لیں...... میں آجاؤں گی اُدھر کرن کے ساتھ کچھ وقت گزار لوں گی...... اس سنڈے کو ملاقات نہیں ہوئی ناں تو اداس ہو رہی ہوں......''

''میں تمہاری طرح فارغ نہیں ہوں...... آج آفس میں ضروری میٹنگ ہے۔ جا رہا ہوں پہلے ہی لیٹ ہو گیا ہوں...... اور میرے خیال میں کرن ہر سنڈے کو نانو کی طرف نہیں جاتی جو اداس ہو رہی ہو...... اگلے سنڈے کو لے کر آؤں گا...... پھپھو کی طرف، مل لینا۔'' انہوں نے فون آف کر دیا...... وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھی۔

حالانکہ کل انہوں نے اچھا خاصا ڈانٹا تھا۔ بدمزہ سا ہو کر انہوں نے صرف چائے کا کپ پیا اور بغیر ناشتے کے ہی آفس چلے گئے۔ حالانکہ رفیق آ گیا تھا مگر انہوں نے اپنے لیے ناشتا بنانے سے منع کر دیا۔ آفس میں بھی یہ ایک تھکا دینے والا دن تھا۔ کھانے کے وقفے میں وہ ایک پراجیکٹ کی فائل دیکھ رہے تھے کہ گھر سے مہراں کا فون آ گیا کہ کرن کو بہت تیز بخار ہے۔ وہ جی ایم کو بتا کر فوراً ہی آفس سے نکل آئے کہ کرن میں ان کی جان تھی...... وہ سوچتے تھے کہ اگر کرن نہ ہوتی تو شاید ان کے پاس جینے کا کوئی جواز نہ رہ جاتا۔

ماں کا انتقال تو اسفند کی شادی کے فوراً بعد ہو گیا تھا اور پھر جب کرن ابھی سال بھر کی تھی کہ اسفند اور آمنہ کار کے حادثے میں انہیں تنہا کر گئے۔ وہ تو سنبھل ہی نہیں پا رہے تھے۔ یونیورسٹی کا آخری سمسٹر تھا وہاں بھی جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ تب بابا نے انہیں احساس دلایا تھا کہ کرن بھی ہے جس کا خیال ان دونوں نے رکھنا ہے...... جو یہ تک نہیں سمجھتی کہ وہ کن رشتوں سے محروم ہو گئی ہے...... آمنہ بھابی نے ماں کی طرح ہی ان کا خیال رکھا تھا۔ حالانکہ وہ ان سے عمر میں بڑی نہیں تھیں۔ تقریباً ہم عمر تھیں لیکن وہ بیاہ کر آئیں تو اماں کے بعد گھر سنبھال لیا۔ بابا کا اور ان کا بالکل اماں کی طرح ہی خیال رکھتی تھیں۔ اب وہ نہیں تھیں تو ان کی کرن کا خیال انہیں ہی رکھنا۔ وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد سارا وقت اس کے ساتھ گزارتے تھے اگرچہ بابا نے اس کے لیے میڈ بھی رکھی ہوئی تھی لیکن جب وہ گھر آتے تو نینی کو تقریباً فارغ ہی کر دیتے...... وقت گزرتا گیا۔ کرن گھر میں بھاگنے دوڑنے لگی۔ اپنی

digest novels lovers group

پیاری، پیاری باتوں سے بابا اوران کا دل بہلائے رکھتی۔ بابا کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلدان کی شادی کردیں لیکن خود کوایک وعدے کی زنجیر سے بانده کر وہ مجبور سے ہوگئے تھے۔ اوراکثر اس کا اظہار بھی کرتے تھے کہ روزِمحشر وہ شاہ میر کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتے۔ اپنی آخری حد تک وہ صبا بھابی کو تلاش کرنا چاہتے تھے اور پاکستان میں انہوں نے تنویر علی کے علاوہ کئی دوستوں سے کہہ رکھا تھا۔ لیکن خود وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں آنے والی نہ جانے کرن کے ساتھ کیا سلوک کرے۔

”اگر وہ شاہ میر کی بیٹی ہوئی تو ہماری کرن کو ہم سے زیادہ چاہے گی۔“

بابا کو پتا نہیں کیوں یقین تھا......اور پھر دو سال پہلے بابا بھی انہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے کہ اسفند اور آمنہ کے حادثے کے بعد انہیں پھر سے دل کی تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ بابا کے بعد کرن کی وجہ سے کچھ دن تیمور بہت پریشان رہے تھے کہ وہ ہر وقت انہیں ڈھونڈتی رہتی ایک، ایک کمرے میں جا کر انہیں آواز دیتی......اور پھر رونے لگتی۔ ”میرے دادا ابو کو لاؤ......“ بہت ضدی سی ہوگئی تھی۔ ایسے میں تنویر چاچو نے جو بابا کی وفات پر وہاں آئے ہوئے تھے، کرن کو بہلانے سمجھانے میں بہت مدد کی تھی اور پھر آخری دنوں میں بابا سے کیا عہد نبھانے کے لیے وہ کرن کو لے کر پاکستان آگئے تھے۔

انہوں نے راستے...... سے ہی ڈاکٹر داؤد کو فون کردیا تھا کہ اگر وہ آسکیں تو کرن کو آکر دیکھ جائیں...... اس وقت انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ کرن کو اتنا تیز بخار ہوگا......جب وہ گھر پہنچے تو کرن کے بیڈ کے پاس کرسی پر کوئی بیٹھا تھا پاس ہی مہراں کھڑی تھی۔ اور وہ جو کوئی بھی تھی ٹیبل پر پڑے پانی کے کٹورے میں پٹیاں بھگو کر کرن کے ماتھے پر رکھ رہی تھی۔

”وہ......وہ جی کرن بٹی تو آنکھیں ہی نہیں کھول رہیں......بہت تیز بخار ہے......“ مہراں رونے والی ہو رہی تھی۔ اسے ہارن کی آواز ہی سنائی نہیں دی تھی شاید گیٹ کھلا تھا کیونکہ ابھی، ابھی رفیق کو بخار کی دوا لینے کے لیے تاشی بی بی نے بھیجا تھا کہ وہ کرن کی حالت دیکھ کر گھبرا کر اسے بلا لائی تھی کہ وہ بخار کی شدت سے بے ہوش سی پڑی تھی اس نے سوچا تھا کہ تیمور علی کے آنے سے پہلے ہی وہ بی بی کو کچن کے راستے واپس بھیج دے گی کہ کچن کا ایک دروازہ پچھلی طرف کھلتا تھا، جہاں سے رفیق وغیرہ اور صفائی کرنے والی ماسی آتی تھی۔ اب وہ گھبرائی ہوئی سی تیمور علی کو دیکھ رہی تھی جبکہ تاشی بی بی بھی گھبرا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اور تیزی سے پیچھے ہٹی تھی۔ تیمور اس کی طرف دیکھے بغیر اس کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے تھے اور کرن کا ہاتھ تھام کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”میری جان......میری گڑیا، میری زندگی......“

”بابا......!“ اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

”پلیز جب تک دوا نہیں آجاتی آپ یہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے رہیں۔ بخار بہت تیز ہے، کم کرنا ضروری ہے۔“ انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے ساکت ہوگئے۔ ان کا خیال تھا کہ مہراں نے گھبرا کر قریبی ہیلتھ سینٹر سے رفیق کو بھیج کر کسی نرس کو بلوا لیا ہوگا......لیکن یہ تو......انہوں نے ایک قہرآلود نظر مہراں پر ڈالی اور بنا کچھ کہے کٹورے میں پڑی پٹی نچوڑنے لگے۔ وہ واپس مڑ رہی تھی جب رفیق دروازے میں نظر آیا۔

”مہراں آپا یہ بخار کی دوا لے آیا ہوں...... وہ میڈیکل اسٹور والا کہہ رہا تھا کہ ہر چار گھنٹے بعد ایک چمچ دے دیں۔“

”کس نے یہ دوا لانے کو کہا ہے؟“

”جی، وہ میں نے کہا ہے۔ تاشی بی بی نے لکھ کر دیا تھا نام......“ مہراں جلدی سے بولی۔ اس نے رفیق کے ہاتھ سے دوا کی شیشی پکڑ لی تھی۔

”آپ ڈاکٹر ہیں کیا......؟ شکر ہے میں وقت

پر آ گیا۔ ورنہ کیا خبر یہ دوا پی کر میری بچی کی حالت زیادہ خراب ہو جاتی۔'' وہ تلخ ہوا۔

''یہ عام سا بخار کا سیرپ ہے سر...... اور عام طور پر گھر میں بخار کی صورت میں پہلے بچوں کو یہی دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس تو بعد میں جاتے ہیں، بخار کم کرنا ضروری تھا ورنہ......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھی تو تیمور علی نے شیشی کو تقریباً پٹختے ہوئے ٹیبل پر رکھا اور ڈاکٹر داؤد کو ایک بار پھر فون کرنے لگے۔ ابھی وہ نمبر ملا ہی رہے تھے کہ ان کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

''دیکھو جا کر ڈاکٹر داؤد ہوں گے۔'' مہراں سے کہہ کر وہ پھر کرن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر داؤد نے آ کر کرن کو دیکھا...... بخار چیک کیا۔

''یہ اچھا کیا کہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنی شروع کر دیں۔ اس سے بخار یقیناً کچھ کم ہوا ہوگا۔''

''میری بچی ٹھیک تو ہو جائے گی ناں داؤد بھائی۔ آگ کی طرح تپ رہی ہے، ہاتھ نہیں لگایا جا رہا۔'' تیمور علی بے حد پریشان تھے۔

''گھبراؤ نہیں یار...... موسمی بخار ہے، بچے بیمار ہوتے رہتے ہیں، آج کل بچوں کو ہو رہا ہے بخار، میرے چھوٹے کو بھی دو تین دن بخار رہا۔'' پھر بات کرتے، کرتے ان کی نظر بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑی دوا کی شیشی پر پڑی تو انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔

''یہ سیرپ کب دیا ہے؟''

''نہیں، ابھی تو نہیں دیا۔''

''اوہ یار، یہ گھر میں تھا تو دے دینا تھا۔ اب تک بخار اتر چکا ہوتا۔''

''نہیں یہ تو ابھی رفیق بھائی لے کر آئے ہیں...... وہ انیکسی والی بی بی نے لکھ کر نام دیا تھا۔'' مہراں ٹرے میں جوس کے گلاس رکھے اندر آئی تھی۔ تیمور نے غصے سے اسے دیکھا۔

''انیکسی والی بی بی؟'' ڈاکٹر داؤد نے ایک معنی خیز نظر تیمور پر ڈالی۔

''جی وہ صاحب نہیں تھے تو میں گھبرا کر انہیں بلا لائی تھی۔ انہوں نے ہی ٹھنڈے پانی میں کپڑا بھگو کر رکھنے کو کہا تھا۔'' مہراں نے ٹرے چھوٹی ٹیبل پر رکھی۔

''بہت اچھا کیا مہراں...... ورنہ تیز بخار بعض اوقات چھوٹے بچوں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔'' انہوں نے expiry date چیک کر کے دوا کی شیشی ڈبے میں سے نکالی اور اس میں موجود پلاسٹک کی چمچی میں دوا ڈال کر کرن کی ناک ہلکے سے دبا کر اس کے منہ میں ڈالی...... وہ کسمسائی لیکن اس نے دوا نگل لی تھی۔ مہراں چلی گئی تو انہوں نے تیمور علی کی طرف دیکھا۔

''بخار چیک کرتے رہنا 102 تک پہنچ گیا تو پٹیاں رکھنی بند کر دینا اور کچھ کھلا پلا بھی دینا۔''

''کیا......؟'' تیمور نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''کچھ بھی ہلکا پھلکا جو یہ شوق سے کھا لے اور یہ ایک اور دوا ہے۔ کچھ کھا لے تو سات آٹھ قطرے اس کے پلا دینا...... اور یہ سیرپ ہر چار گھنٹے بعد دینا ہے...... اول تو دو تین روز میں بخار اتر جائے گا اور اگر نہ اترا تو پھر ٹائیفائڈ کا ٹیسٹ بھی کروا لیں گے۔ آج کل بچوں کو ملیریا اور ٹائیفائڈ بھی ہو رہا ہے۔'' انہوں نے جوس کا گلاس اٹھایا۔

''بابا......'' کرن کسمسائی تھی اور اس نے ماتھے پر پڑی پٹی ہٹا دی تھی۔

''میری جان......'' تیمور اس پر جھک گئے۔

''یہ بہت ٹھنڈی ہے۔''

''لیکن آپ کو بخار ہے ناں تو اس سے بخار اتر جائے گا۔'' انہوں نے دوبارہ پٹی رکھی تو اس نے پھر ہٹا دی۔

''رہنے دو...... میرا خیال ہے بخار مزید کم ہوا ہے۔ کچھ دیر بعد چیک کرنا۔''

خالی گلاس ڈاکٹر داؤد نے ٹیبل پر رکھا اور کھڑے ہو گئے۔ پیشنٹ چھوڑ کر آئے تھے کہ کرن کے لیے وہ بھی بہت حساس تھے کہ وہ اسفند کی بیٹی تھی اور اسفند سے دوستی اور تعلق بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔

''کھانا تو نہیں کھایا ہوگا ابھی آپ نے؟'' تیمور علی کو خیال آیا تھا کہ کھانے کا وقفہ تھا جب مہراں کا فون آیا تھا۔

digest novels lovers group
urdunovels.com

"ہاں یار بس ایک دو پیشنٹ رہتے تھے سوچ رہا تھا کہ منگواتا ہوں ابھی، ثمیرا تو شام تک آئے گی۔"

کھانا وہ گھر پر ہی آکر کھاتے تھے یا اگر کسی وجہ سے دیر ہو جاتی تو ثمیرا بھجوا دیتی تھی۔

"تو پھر کھانا کھا کر ہی جائیں...... رفیق بھائی نے کھانا تیار کر ہی لیا ہوگا، میں کہتا ہوں کھانا لگانے کو...... پیشنٹ کو ڈاکٹر احمد دیکھ لیں گے...... دو بجے کے بعد تو آجاتے ہیں ناں وہ۔"

"ہاں، وہ تو میں کہہ کر آیا تھا۔ پہلے رفیق سے پوچھ کر بتاؤ کیا پکایا ہے۔ ٹنڈے، کدو نہیں کھانے میں نے اور وہ کیا جو اس روز بنا رکھا تھا اس نے بینگن کا بھرتا۔" بے حد خوشگوار موڈ میں کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئے تھے۔ تیمور علی آہستگی سے اٹھے اور جاتے، جاتے جھک کر کرن کی پیشانی چومی۔

"اب کچھ کم گرم لگ رہی ہے۔"

"ان شاء اللہ جلدی اتر جائے گا بخار، یہ بھی کریم کو بھیج کر منگوالو......" اور جب وہ کریم کو نسخہ دے کر اور رفیق کو کھانا لگانے کا کہہ کر واپس آئے تو کرن آنکھیں کھولے ڈاکٹر داؤد سے باتیں کر رہی تھی...... اور وہ تھرمامیٹر دیکھ رہے تھے۔

"بخار کم ہو گیا ہے لیکن ہنڈرڈ سے اوپر ہے ابھی......"

"میری گڑیا کیسی ہے اور یہ بخار کیوں ہو گیا میری جان کو؟" بیڈ پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے انہوں نے اسے گود میں بٹھا لیا تھا۔

"ٹھیک ہوں بابا...... اور بخار تو خود ہی ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں...... اور مجھے اتنی پیاس لگ رہی تھی کہ میں نے آپ کو بلایا تھا...... اور پھر وہ پری آگئی۔ اس نے پانی پلایا تھا۔" اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"بابا وہ پری کہاں گئی ہے؟"

"بیٹا یہاں تو کوئی پری نہیں ہے...... آپ نے خواب دیکھا ہوگا......" تیمور نے اس کے سر پر پیار کیا۔

"نہیں بابا پری تھی...... اس نے مجھے پیار کیا تھا، میرا نام بھی پوچھا تھا۔" اس نے پھر کہا تو ڈاکٹر داؤد مسکرائے۔

نبی اکرم ﷺ کا خطبہ رمضان کی آمد پر

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ دیا۔ فرمایا۔

"اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ اس مہینے کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ خداوندی میں کھڑے ہونے کو افضل عبادت مقرر کیا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر فرض عبادت ادا کرے گا تو اس کو دوسرے دنوں کے فرضوں کے برابر ثواب ملے گا اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ہے۔

رمضان کا مہینہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینے میں کسی روزے دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب کے لیے) افطار کرایا تو اس کے لیے گناہوں کی بخشش اور آتشِ دوزخ سے نجات کا ذریعہ ہوگا۔ اس کو روزے دار کے برابر ثواب دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ہم میں سے ہر شخص اتنا امیر تو نہیں ہے کہ وہ روزے دار کو افطار کرا سکے۔ تو کیا غربا اس ثواب سے محروم ہو جائیں گے؟ آپ ﷺ نے عرض کیا۔ اس کا ثواب اس شخص کو بھی اتنا ہی ملے گا جو لسی کے ایک گلاس سے یا پانی کے ایک گھونٹ پر یا ایک خرمے پر کسی روزے دار کا روزہ افطار کروا دے۔ اور جو کوئی کسی روزے دار کو پورا کھانا کھلا دے گا اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی حوض کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا کہ جس کے بعد اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا، اس ماہ مبارک کا پہلا حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتشِ دوزخ سے نجات ہے۔ پھر ارشاد فرمایا۔ جو شخص اس ماہ اپنے غلام، خادم کے کاموں میں نرمی کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا اور اس کو دوزخ سے رہائی اور آزادی دے، دے گا۔ (شعب الایمان بیہقی)

انتخاب: ریحانہ حسن، کراچی

"ہاں بیٹا وہ پری اب چلی گئی ہے آپ کو اچھی لگی تھی تو ہم اس سے کہیں گے کہ وہ پھر آپ کے پاس آجائے۔"

"جی انکل...... آپ کو پتا ہے وہ کہاں رہتی ہے؟"

"بالکل پتا ہے۔" انہوں نے تیمور علی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"ارے نہیں گڑیا...... بھلا پریاں یہاں کہاں ہوتی ہیں وہ تو بس کہانیوں میں ہوتی ہیں، آپ نے خواب دیکھا ہوگا...... انکل تو مذاق کررہے ہیں...... اچھا میرے بچے کو بھوک لگی ہے...... دودھ پئیں گے کارن فلیکس ڈال کر؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے مہراں کو آواز دے کر دودھ لانے کو کہا...... مہراں دودھ اور کارن فلیکس لے کر آئی تو ساتھ ہی کھانا لگنے کی اطلاع بھی دی۔

"آیئے داؤد بھائی...... آلو قیمہ اور کریلے گوشت پکایا ہے رفیق نے۔" انہوں نے کرن کو بیڈ پر ہی بٹھایا اور مہراں سے کہا کہ اسے کارن فلیکس کھلا دے اور اس کے پاس ہی بیٹھے۔ وہ کھانا کھا کر آتے ہیں۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں داؤد بھائی۔" ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے وہ بولے۔

"وہ سچ سمجھ رہی تھی کہ واقعی کوئی پری آئی تھی۔"

"آئی تو تھی وہ انیکسی والی...... کرن غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔ اگر پریوں کا کوئی وجود ہوتا تو ایسی ہی ہوتیں......" شرارت سے کہتے ہوئے وہ پلیٹ میں سالن ڈالنے لگے تو لمحہ بھر کے لیے وہ بالکل خاموش ہوگئے۔ انہیں مہراں پر غصہ آیا کہ کیا خود کچھ نہیں کرسکتی تھی جو اسے بلا لائی تھی حالانکہ کتنی تاکید کر رکھی تھی انہوں نے اسے کہ وہ انیکسی سے بھی باہر نہ نکلے اور وہ اسے اندر یہاں گھر لے آئی تھی۔

"ایک بات کہوں تیمور......!" انہیں خاموش دیکھ کر ڈاکٹر داؤد نے کہا۔

"اسے...... مطلب اس لڑکی کو کرن کے لیے ملازم رکھ لو...... تمہیں دیر سویر ہوجاتی ہے۔ مہراں اس کا اس طرح خیال نہیں رکھ سکتی جس طرح یہ رکھ سکے گی۔ پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ کرن جو رضوانہ کے چلے جانے کے بعد اداس اور خاموش سی رہنے لگی ہے بقول تمہارے اپنے ہی...... اس کے ساتھ خوش رہے گی۔ انیکسی میں تو وہ رہ ہی رہی ہے۔ کچھ تنخواہ دے دینا...... پہلے بھی میں نے تمہیں کہا تھا...... میری بات پر غور کرنا اور کوئی کیوں باتیں بنائے گا...... رضوانہ بھی تو ینگ تھی...... گھر کے اندر رہتی تھی...... اور یہ تو انیکسی میں رہے گی جیسے سرونٹ کوارٹر میں ملازم رہتے ہیں۔ سمیرا کہہ رہی تھی کہ اسے رہنے کو محفوظ ٹھکانا چاہیے...... اور بس پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا۔ زیادہ ڈیمانڈ بھی نہیں ہے...... اپنی تعلیمی اسناد کھو چکی ہے اور مسز انصاری پاؤں کی ہڈی تڑوا کر پلاسٹر چڑھائے بیٹھی ہیں کراچی میں...... کہاں جائے بیچاری، شاید یہ سب اللہ کی طرف سے ہے تیمور...... کہ کرن کے لیے تمہاری فکر دور ہوجائے گی۔" تیمور علی نے خاموشی سے ان کی بات سنی اور ڈونگا ان کی طرف بڑھایا۔

"داؤد بھائی یہ کریلے گوشت تو لیں آپ کا پسندیدہ......"

UUNovels.com

"سمیرا نے تو مسز انصاری کے پاؤں کا سن کر دو تین بار مجھ سے کہا ہے کہ تیمور بھائی پریشان ہیں تو ہم اسے گھر لے آتے ہیں۔ گیسٹ روم میں رہ لے گی۔" تیمور نے چونک کر انہیں دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ تیمور کیوں چونکے ہیں۔

"یار سمیرا کو مجھ پر بہت ٹرسٹ ہے...... وہ اس روز تو جو کچھ میں نے کہا تھا۔ وہ مذاق میں کہہ رہا تھا لیکن سمیرا کی ایک کزن نے ترس کھا کر ایک لڑکی کو گھر میں پناہ دی تھی، اس لڑکی نے اس کا گھر ہی اجاڑ دیا تو اگر ہم اسے گھر لے جائیں گے تو سمیرا کے میکے والوں نے جان ہی کھا لینی ہے اس کی......"

"اس کا مطلب ہے کہ مسز انصاری ابھی نہیں آرہی ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں میں خود دیکھ لیتا ہوں......" انہوں نے بس اتنا ہی کہا۔

اس نے انہیں اپنی اسناد کی نقل کے لیے کہا تھا، وہ اسلام آباد میں کوئی لنک تلاش کرتے ہیں...... اور کہیں

نہ کہیں جاب دلوا دیں گے۔ ڈاکٹر داؤد نے کہا تھا کہ وقت لگے گا لیکن استاد کی نقل مل جائے شاید۔

"یا پھر شادی کر لو......" ڈاکٹر داؤد نے بہت غور سے انہیں دیکھا۔" مزید تلاش بیکار ہے، سین کے علاوہ اور بھی لڑکیاں ہیں دنیا میں، سمیرا سے کہوں گا تمہارے لیے کوئی لڑکی دیکھے......ویسے لڑکی دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبا کر مسکرائے۔

"اللہ میاں نے خود ہی بھجوا دی ہے۔"

"داؤد بھائی پلیز......" انہوں نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

"سوری......یار میں تو بس ویسے ہی ......سمیرا آ جائے تو ایک دو روز میں تمہاری پریشانی دور کر دیتے ہیں۔ سمیرا اپنی ایک دوست کا ذکر کر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ اکیلی رہتی ہے۔ میاں سے علیحدگی ہو چکی ہے، کہہ رہی تھی کہ واپس آ کر اس سے بات کرتی ہوں......" ڈاکٹر داؤد نے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے۔

"بس صرف دو دن اور......"

"شکریہ داؤد بھائی......" انہوں نے جہاں اطمینان محسوس کیا وہاں یک دم دل میں اداسی سی اتر آئی تھی۔

"بابا......" کرن نے ڈائننگ روم میں جھانکا۔ مہراں اس کے پیچھے تھی۔

"بابا آپ میرے پاس کیوں نہیں آئے اتنی دیر لگا دی......میں نے تو جلدی سے سب فنش کر دیا تھا۔"

"سوری بیٹا......!" تیمور نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

"کھانا کھاتے ہوئے دیر ہو گئی......بابا کو بہت بھوک لگی تھی ناں......"

"اچھا ٹھیک ہے، اب چلیں میرے روم میں اور مجھے اچھی سی کہانی سنائیں......سنائیں گے ناں......"

"ہاں سناؤں گا......" انہوں نے اسے پیار کیا۔

"پری والی......" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور مہراں سے کہا کہ کریم جو ڈاکٹر کی بتائی دوا لایا ہے، وہ لے کر آئے کرن کے کمرے میں۔

"میں اب چلتا ہوں تیمور......ان شاء اللہ اب تیز بخار نہیں ہوگا......البتہ تھوڑا بہت تو رہے گا ہی......کوئی مسئلہ ہو تو فون کر لینا۔ میں کلینک کا ایک چکر لگا کر گھر ہی جا رہا ہوں......" ڈاکٹر داؤد کھڑے ہو گئے تھے۔

"چائے یا قہوہ......؟"

"کچھ نہیں یار......کھانا رفیق نے بہت مزے کا بنایا تھا۔ زیادہ ہی کھا گیا ہوں......"

وہ ڈاکٹر داؤد کو خدا حافظ کہہ کر کرن کو گود میں اٹھائے، اٹھائے اس کے کمرے میں آئے اور اسے لٹاتے ہوئے خود بھی اس کے ساتھ ہی بیڈ پر لیٹ گئے۔ دوا پلا کر وہ اسے کہانی سنانے لگے تو وہ کہانی سنتے، سنتے ہی سو گئی......اور وہ ڈاکٹر داؤد کی کہی باتوں کے متعلق سوچنے لگے۔ انہیں کرن کی دیکھ بھال کے لیے کسی سمجھدار خاتون کی ضرورت تھی تو......جو سارا وقت اس کے ساتھ رہے......آج آفس جا کر جب انہوں نے تنویر چاچو سے بات کی تھی تو انہوں نے بھی تو اسی طرح کا مشورہ دیا تھا۔ وہ شاہ میر تایا کے سسرالی عزیزوں کے متعلق نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ شاہ میر تایا کی شادی میں دادا جان کی اجازت کے بغیر گئے تھے اور نکاح کے فوراً بعد ہی واپس آ گئے تھے کہ انہیں دادا جان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ تب انہوں نے تنویر چاچو کو بابا کی خواہش اور ان سے کیے ہوئے وعدے کے متعلق بتایا تو یہ جان کر وہ حیران رہ گئے کہ انہیں اس کا علم تھا۔

"ازمیر بھائی نے بتایا تھا مجھے اور میں نے ہی شاہ میر بھائی کو تمہارے بابا کا فون نمبر اور پتا دیا تھا۔" اب وہ پھر حیران ہوئے تھے۔

"آپ شاہ میر تایا سے ملتے رہتے تھے، پتا تھا آپ کو ان کا تو آپ نے بابا کو کیوں نہ بتایا کتنا تڑپتے تھے وہ ان کے لیے......؟"

"نہیں، مجھے ان کا پتا نہیں تھا۔ اس روز اتفاقاً لاہور ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے میری نظر ان پر

digest novels lovers group
urdunovels.com

پڑ گئی تھی۔ وہ روڈ کنارے کسی سواری کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ چار گھنٹے بعد میری فلائٹ تھی۔ ہم امان کے پاس جارہے تھے اور شاہ میر بھائی نے اسی روز از میر بھائی سے رابطہ کرلیا تھا۔ اور پھر ابھی ہم مشی گن میں ہی تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ ہم تین چار ماہ کے لیے امریکا گئے تھے کیا پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی چلے جائیں گے۔ خیر صبا بھابی کے والد کے ایک جاننے والے ہیں، ان سے اتفاقی ملاقات ہوئی ہے چند دن پہلے، ان سے پتا کرتا ہوں شاید انہیں علم ہو صبا بھابی کے کزن کا...... میں تو خود کب سے انہیں تلاش کررہا ہوں کہ میرے دل پر بھی ایک امانت کا بوجھ ہے۔ اور تیمور بیٹے پتا نہیں وہ لوگ ملیں گے یا نہیں...... تم کب تک انتظار کرو گے...... میں ابا جان سے بات کروں گا...... سیمین نہ سہی...... کوئی اور سہی...... کرن کو ماں کی ضرورت ہے۔ یہاں پھر بھی کچھ سہولت ہے۔ بڑی آپا ہیں وہ کرن کی نانو ہیں...... وہاں سب اس کے ماموں ان کے بچے پیار کرتے ہیں اس سے...... گھر میں مہراں ہے دوسرے ملازموں کی سہولت ہے لیکن جیسا کہ تم واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہو تو بیٹا وہاں تو یہ بالکل تنہا ہو جائے گی تو جوں، جوں بڑی ہوگی اور بھی تنہائی محسوس کرے گی۔ اس لیے جانے سے پہلے تم شادی کرلو......''

انہوں نے سمجھایا تھا۔ سب ہی یہ ہی بات کہتے تھے اور شاید ٹھیک ہی کہتے تھے...... ڈاکٹر داؤد بھی تو ایسا ہی کہہ رہے تھے پھر ڈاکٹر داؤد کی بات یاد آتے ہی آنکھوں کے سامنے وہ آگئی...... پتا نہیں کیا بات تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی شکل دن میں کئی بار ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتی لیکن وہ اس کا خیال فوری جھٹک دیتے۔

انہوں نے رخ موڑ کر کرن کی طرف دیکھا اور بہت آہستگی سے اپنا بازو اس کے سر کے نیچے سے نکال کر اس کا سر تکیے پر رکھا۔ وہ بہت پُرسکون نیند سو رہی تھی۔ وہ ہر روز یوں آفس سے اٹھ کر اس کے لیے نہیں آسکتے تھے۔ ان کا جی ایم ورکرز کو چھٹی دینے کے حوالے سے خاصا سخت تھا۔ اگر رضوانہ ہوتی تو وہ بے فکر ہو کر کل آفس چلے جاتے لیکن...... انہیں پھر اس کا خیال آیا تھا۔

''اگر وہ ڈاکٹر داؤد کی بات مان کر اسے ملازم رکھ لیں تو...... انیکسی میں رہ رہی ہے۔ میری عدم موجودگی میں یہاں کرن کے پاس آجایا کرے گی...... اور پھر میں اپنے گھر جس کو بھی ملازم رکھوں اس کے لیے میں کسی کو جواب دہ نہیں ہوں...... لیکن یہ لڑکی......'' ابھی تک وہ اس کا نام تک نہیں جانتے تھے، مہراں کو انہوں نے اسے تاشی بی بی کہہ کر بلاتے سنا تھا دو تین بار...... ''یہ بھلا کیا نام ہوا......'' انہوں نے سوچا۔ ''شاید اس نے خود ہی مہراں کو غلط سلط نام بتا دیا ہو...... گاڑی کے حادثے والا بھی تو اتنا بڑا جھوٹ بولا تھا'' اور اس جھوٹ کی وجہ سے وہ اس پر اعتبار نہیں کر پا رہے تھے لیکن ڈاکٹر داؤد اور سمیرا بھابی نے اس بات کو اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ شاید سمیرا بھابی نے پوچھا ہو اس سے اس کے متعلق اور بتایا ہو کہ اُدھر تو کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے اس نے انہیں اس جھوٹ کی وجہ بتادی ہو۔ ''نہیں میں ایسی ... بے اعتبار لڑکی کی نگرانی میں کرن کو نہیں دے سکتا۔ دادا جان سے ہی کہوں گا گاؤں سے کسی کو بھجوا دیں یا پھپو سے کہوں گا کہ کسی اچھی سی لڑکی کا انتظام کردیں...... اور پھپو فوراً کہیں گی ''سیمین سے شادی کرلو...... وہ خود ہی کرن کا خیال رکھ لے گی......'' وہ بیڈ سے اٹھے ... وہ یہاں کرن کے کمرے میں خود کو بے آرام محسوس کرتے تھے۔ وہ سو رہی تھی اس لیے وہ مہراں کو اس کے پاس چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئے تھے اور مہراں کو بتا دیا تھا کہ جب تک کرن بیمار ہے وہ ان ہی کے کمرے میں ہی سوئے گی۔ اس لیے اس کے جاگنے کے بعد وہ اس کی ضرورت کا سامان ان کے کمرے میں رکھ دے...... سر بہت بوجھل ہو رہا تھا اس لیے تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے انہوں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ اور ابھی آنکھیں موندی ہی تھیں کہ بڑی پھپو کا فون آگیا۔

''سیمین بتا رہی تھی کہ تم کل کرن کو لاہور لے گئے تھے۔ ہم انتظار ہی کرتے رہے، کل آمنہ کی پھپو آئی

ہوئی تھیں ملنا چاہ رہی تھیں اس سے، آج لے آؤ اسے ملانے کے لیے...... کیا کر رہی ہے وہ بات کرا دو......"

"جی وہ سو رہی ہے تو آج تو ذرا مشکل ہے، ایک دو روز میں لے آؤں گا......"

کرن ان کی نواسی تھی وہ انہیں منع نہیں کر سکتے تھے۔ اسفند اور آمنہ کے حادثے کے بعد ان لوگوں نے بہت چاہا تھا کہ کرن ان کے پاس ہی رہے لیکن پاپا اور وہ نہیں مانے تھے۔

"کیسے سنبھالیں گے اسے...... بھابی ہوتیں تو میں نہ کہتی لیکن اب...؟" وہ اسے ساتھ ہی لے جانا چاہتی تھیں۔

"ہم سنبھال لیں گے لیکن اس کے بغیر جی نہیں پائیں گے کہ ہمارے پاس اب ہے ہی کون......" اور بابا کی بات سن کر وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

"یہ سین کیا کہہ رہی ہے کہ تم واپس جانے کا پروگرام بنا رہے ہو۔" انہوں نے وہ بات کی جس کے لیے فون کیا تھا۔

"جی جانا تو ہے ہی پھپو...... وہاں گھر ہے، بابا کی، اماں کی اسفند بھائی اور آمنہ بھابی کی قبریں ہیں...... میں تو بس کرن کو آپ سب سے ملوانے کے لیے لے کر آیا تو دادا جان نے روک لیا کہ آئے ہو تو کچھ عرصہ اپنے ملک میں رہ لو......"

انہوں نے کسی کو بھی اپنے آنے کی اور یہاں رہنے کی وجہ نہیں بتائی تھی۔

"کتنا کہا تھا ابا جان نے کہ بھابی کی میت پاکستان لے آؤ اپنی مٹی میں دفن کرو لیکن از میر بھائی مانے ہی نہیں...... اجنبی دیس کی مٹی کے حوالے کر دیا اپنے پیاروں کو......" پھپو نے گلہ کیا۔

"کتنی مشکل سے اور کتنی بھاگ دوڑ کرنے کے بعد ویزا ملا تھا اور آخری بار اپنی بیٹی کی شکل دیکھ پائی تھی۔" وہ آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

"ان کے نصیب میں وہاں کی ہی مٹی لکھی تھی پھپو۔" کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"ہاں ان کا نصیب لیکن تیمور بیٹا تم اب یہاں سے مت جاؤ...... کرن کی خاطر ادھر ہی رک جاؤ...... اور اگر جانا بھی ہے تو پھر شادی کر کے جاؤ......" بڑی پھپو نے پہلی بار انہیں شادی کے لیے کہا تھا۔

"جی سوچوں گا میں......" کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ گزرا وقت آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگا تھا۔ جب اماں کا انتقال ہوا تھا تو وہ بے حد ڈسٹرب تھے۔

"مجھے تمہاری اماں کو لے کر وہاں نہیں جانا تھا تیمور، وہاں کی مٹی، وہاں کی ہوائیں مجھے پکارتی تھیں، آوازیں دیتی تھیں اور میں نے نہ جانے کتنی بار تمہاری اماں سے کہا تھا کہ اگر میں یہاں مر جاؤں تو مجھے اپنے گاؤں کی، اپنے وطن کی مٹی میں دفن کرنا۔"

اسی کے استفسار پر بابا نے بتایا تھا کہ دادا جان، اماں کی میت کو گاؤں نہ لے جانے پر بہت ناراض اور خفا تھے۔ اور تیمور علی وجہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر بابا، اماں کو وہاں لے کر کیوں نہیں گئے۔ تیمور کے ننھیال میں سے بھی تو کوئی اماں کی وفات پر نہیں آسکا تھا۔

urdunovels.com

"جب پچھلے سال میں گاؤں گیا تو میں نے دل میں عہد کیا تھا کہ اب کبھی یہاں نہیں آؤں گا...... وہاں کی ہوائیں بہت ظالم ہو گئی تھیں...... وہاں حویلی میں جتنے دن رہا دم گھٹتا تھا میرا۔ شاہ میر کے متعلق سیکڑوں بار میں نے تمہیں بتایا تھا لیکن آج بیٹا تیمور میں تمہیں جو بتاؤں گا وہ سال بھر پہلے تک میں بھی نہیں جانتا تھا۔ شاہ میر کی ماں اور میری ماں تو ایک تھی لیکن باپ ایک نہیں تھا۔ میری عادت تھی کہ فجر کی نماز کے بعد میں واک کے لیے جاتا تھا۔ اپنی زمین میں لہلہاتے کھیت دیکھ کر دل بہت خوش ہوتا تھا۔ جب شاہ میر تھا تو ہم دونوں دیر تک اپنی زمینوں پر گھومتے رہتے۔ پھلوں کے باغ میں جاتے تو اس روز بھی میں واک کے لیے گیا تو ایک طرف کھڑا دور تک گندم کے خوشوں سے بھرے اپنے کھیتوں کو دیکھ رہا تھا تو منشی اللہ دتا بھی اتفاق سے وہاں آ گیا نہ جانے کس بات پر کہنے لگا کہ "یہ ادھر والی ساری زمین شاہ میر صاحب کے باپ کی

ہے۔ اور اُدھر والی آپ کے ابا جان کی، دونوں باغ بھی شاہ میر صاحب کے والد کے ہی ہیں۔ سرگودھا والے مربعے آپ کی والدہ کے ہیں۔"

میں حیران سا منشی صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ ہم بہن، بھائیوں میں سے کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ اماں جان نے کبھی ذکر کیا نہ ابا جان اور گھر کے کسی اور فرد نے ہمیں بتایا۔ اب میں نے جانا تھا کہ اماں اس وقت مجھ سے اور شاہ میر سے کیا کہنا چاہتی تھیں اور مرنے سے پہلے انہوں نے ہم سے وہ وعدے کیوں لیے تھے۔

"اور اب یہ سب......" میں بے خیالی میں زمین کو دیکھ رہا تھا۔

"شاہ میر صاحب ہوتے تو وہ ہی وارث تھے اور ان کی اولاد......نہ جانے کہاں اور کیوں چلے گئے۔"

وہ افسوس کرتا ہوا چلا گیا اور پھر میں نے پھوپی سے پوچھا تو انہوں نے تصدیق کر دی۔

"تمہاری اماں کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ خوب صورت تھیں صاحب جائداد تھیں۔ اپنے خاندان کی تھیں تو سب بڑوں کی رائے اور بھائی صاحب کی رضامندی سے ان کی شادی تمہارے ابا جان سے ہوگئی۔ شاہ میر تب تقریباً دو سال کا ہوگا۔ بھائی صاحب نے اسے ہمیشہ اپنی اولاد ہی سمجھا......کبھی تم لوگوں اور اس میں تفریق نہیں کی۔ شاہ میر کو بھی علم نہیں ہونے دیا کبھی۔"

پھپھو بالکل صحیح کہہ رہی تھیں میرے دل میں ابا جان کا احترام بڑھ گیا......لیکن بس دو دن بعد میرا دم گھٹنے لگا وہاں۔ ابا جان کے لیے جو ایک اضافی احترام پیدا ہوا تھا میرے دل میں وہ اسی لمحے ختم ہو گیا۔ جب تنویر نے مجھ سے کہا۔

"ازمیر بھائی مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے......اس راز کا بہت بوجھ ہے میرے دل پر......"

ہم اس وقت ٹیوب ویل پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"شاہ میر بھائی جب حویلی آئے تھے تو ان کے بیٹے کو ابا جان نے ہی اغوا کروایا تھا۔ اور اغوا کرنے والے سے کہا تھا کہ اسے مار کر اس کی لاش جنگل میں پھینک دینا۔ جانور کھا جائیں گے......اپنی پسند کی شادی کرنا اتنا بڑا جرم تو نہیں تھا جس کی اتنی بڑی سزا دی ابا جان نے، کیوں کیا ایسا؟" تنویر کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اس لیے کہ شاہ میر ان کے نہیں اماں کے بیٹے تھے۔" مجھے دو جمع دو کرنے میں لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔ "یہ سب شاہ میر کے حصے کی زمین اور باغات کے لیے کیا تھا ابا جان نے۔ اماں کی زمین میں بھی ان کا حصہ تھا۔ پہلے شادی کا بہانہ بنا کر انہیں گھر سے نکال دیا اور پھر......"

میں نے تنویر کو بھی اس راز کا امین بنا لیا......لیکن ابا جان کو نہیں معلوم کہ ہمیں یہ سب معلوم ہو چکا ہے۔ ہمارے سامنے وہ یہ ہی ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے انہیں شاہ میر کے جانے اور اس کے بیٹے کے گم ہونے کا بہت دکھ ہے......" مجھے وہ حویلی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ وہ زمین، وہ باغات سب......شاہ میر کی دوری کا سبب بن گئے تھے۔ میرا دم گھٹتا تھا وہاں......ابا جان شاہ میر کے مجرم تھے......اس کے بچے کے قاتل......اور میں یہاں آگیا، مجھے اب وہاں نہیں جانا، تیمور تم بھی یاد رکھنا......مجھے یہاں ہی دفنانا اپنی ماں کے پہلو میں۔" وہ بہت دکھی تھے، بہت آزردہ تھے۔

"یہ زمین، جائداد، دولت پیسہ سب یہاں ہی رہ جانا ہے پھر ہم اس کے لیے ظالم کیوں بن جاتے ہیں تیمور مجھے سمجھ نہیں آتا۔ اچھا ہوا شاہ میر حویلی سے چلا گیا۔ ورنہ کیا خبر وہ اسے بھی مروا دیتے۔ یہ دولت کی ہوس کتنی ظالم ہوتی ہے تیمور کہ انہیں یہ بھی خیال نہیں آیا کہ بچپن میں میرے ساتھ اس کی بھی انگلی پکڑ کر وہ مسجد جاتے تھے۔ اسے بھی اپنے سینے پر سلایا تھا۔ تم ہمیشہ دولت اور پیسے کو عارضی سمجھنا جسے جاتے ہوئے تم نے یہاں ہی چھوڑ جانا ہے۔ اس کے پیچھے کبھی مت بھاگنا۔" اور بابا اس کے بعد کبھی گاؤں نہیں گئے......دادا جان کے اصرار کے باوجود۔

"شاہ میر ہمارے ماں جائے ہیں۔ ان کی محبت ہمارے دل میں کم ہونے کے بجائے پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے یہ محبت ہمارے خون میں رچی ہوئی ہے۔"

digest novels lovers group
urdunovels.com

بابا نے کہا تھا۔

”تم نہیں جانتے تب سے تنویر اور میں انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہاں اس ملک میں رہ کر بھی میں نے ان لوگوں سے رابطے رکھے ہوئے ہیں جو شاہ میر کے دوست تھے انہیں جانتے تھے کہ شاید کبھی کوئی خبر مل جائے۔ لیکن پتا نہیں یار دنیا کے اس اتنے بڑے سمندر میں وہ کہاں کھو گئے ہیں۔ تنویر کہتا ہے...... وہ مل جائیں ایک بار تو ان کی امانت انہیں لوٹا دیں مجھے تنویر کی سوچ پر پیار آتا ہے۔ پتا نہیں اتنی زمین اور باغات کے ہوتے کیسے زندگی گزارتے ہوں گے...... پتا نہیں ان کی جاب کیسی ہوگی......؟ فیملی کے ساتھ کیسے گزارہ کرتے ہوں گے...... مجھے اپنا آپ مجرم سا لگتا ہے تیمور، وہ مل جائیں تو ابا جان کی زیادتیوں کی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں......“ لیکن شاہ میر تایا ملے بھی تو کب جب انہیں موت کے پیروں کی چاپ سنائی دے رہی تھی اپنی موت سے صرف پندرہ دن پہلے ان کا فون آیا تھا اور بابا نے روتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

”میرا بھائی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کے پاس وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ اور اپنے ان آخری دنوں میں وہ ہمیں اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہے...... لیکن ڈاکٹر مجھے سفر کی اجازت نہیں دے رہے۔ تنویر اپنے بیٹے کے پاس ہے...... وہ اسے ساتھ ہی لے کر جانا چاہتا ہے اور ابھی وہ جا نہیں سکتا...... شاید اپنی پڑھائی کی وجہ سے...... تنویر نے تفصیل نہیں بتائی...... دیکھوناں تیمور...... تین ماہ پہلے تنویر کو وہ ملے تھے اور تنویر نے انہیں میرا نمبر اور پتا دیا تھا لیکن انہوں نے فون کیا نہ خط لکھا۔ کہتے تھے میری ہمت ہی نہیں ہوتی تھی تمہیں فون کرنے کی کہ اتنے سالوں بعد تمہیں فون کر کے دائمی جدائی کی خبر دوں...... اچھا ہے کہ تم ہمیشہ یہ سوچتے رہو کہ میں زندہ ہوں اپنے بچوں کے ساتھ خوش زندگی گزار رہا ہوں لیکن اب مجبور ہو گیا ہوں میرو......“ دیکھوناں یار تنویر نے بھی نہیں بتایا کہ شاہ میر ملے تھے...... وہ کہتا ہے کہ کیا بتاتا آپ کو، شاہ میر بھائی کے گھر فون نہیں تھا۔ کوئی نمبر نہیں دیا تھا مجھے۔ گھر کا پتا دیا تھا انہوں نے۔ سوچا تھا کہ امان کو ڈگری مل جائے تو پاکستان اکٹھے جائیں گے ان کے لیے کسی اچھے علاقے میں اچھا سا گھر لوں گا...... انہوں نے جو پتا دیا تھا وہ اندرون شہر کے کسی چھوٹے سے محلے کا پتا تھا۔

میں نے وہ چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا اپنے والٹ میں

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرون ممالک کے لیے زرسالانہ 30,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0334-5498977
0301-2454188

سرکولیشن منیجر محمد شہزاد خان: 0333-2256789

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

رکھا تھا۔ ائرپورٹ پر ہی والٹ سے کچھ نکالتے ہوئے وہ گر گیا۔ پھر کیا بتاتا آپ کو پھر سے امید پیدا کر دیتا آپ کے دل میں۔ بار، بار امیدوں کا ٹوٹنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے بھائی۔ مجھے کیا پتا تھا وہ اتنے بیمار ہیں، سمجھا تھا بیٹے کی جدائی نے انہیں اتنا کمزور کر دیا ہے۔ سوچا تھا وہاں جا کر اس محلے کا ایک، ایک دروازہ کھٹکھٹاؤں گا...... کسی نہ کسی دستک پر وہ دروازہ کھولیں گے تو...... پھر یہ بھی امید تھی کہ وہ آپ کو ضرور فون کریں گے...... لیکن زندگی بھی، کبھی ہمارے ساتھ ایسے مذاق کر جاتی ہے کیا تھا اگر پتا گم نہیں ہوتا تو......"

بابا اس روز کتنا روئے تھے...... بار، بار کہتے تھے' تیمور، ڈاکٹر سے کہو مجھے سفر کی اجازت دے۔ میرا چیک اپ کسی طرح مقررہ تاریخ سے پہلے کروا دو...... موت تو اپنے وقت پر آنی ہے تو بس پھر ہم دونوں ہی پاکستان چلے جائیں گے۔"

بابا کی اس وقت کی تڑپ...... دکھ اور تکلیف یاد کر کے ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے...... کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کاش وہ بابا کے ساتھ کیا ہوا عہد نبھا کر ان کی روح کو خوش کر سکتے۔ کلائی الٹ کر انہوں نے وقت دیکھا...... مغرب کی اذان ہونے ہی والی تھی...... وہ اٹھ کر باہر لاؤنج میں آئے تو کرن صوفے پر بیٹھی کارٹون دیکھ رہی تھی۔

"کیسا ہے میرا بچہ......؟" انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا۔

"میں تو ٹھیک ہوں، اب بخار بھی نہیں ہے لیکن آپ ٹھیک نہیں ہیں۔"

"ہیں، مجھے کیا ہوا؟" وہ ہنسے۔

"آپ بیٹھے، بیٹھے سو رہے تھے، میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ پھر میں واپس آ گئی کہ آپ ڈسٹرب نہ ہوں......"

"ارے واہ میری بیٹی کو میرا اتنا خیال ہے۔" انہوں نے اسے صوفے پر بٹھا لیا۔

"آپ بھی تو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔"

"تو میری جان یہ تو میرا فرض ہے ناں کہ اپنی بیٹی کا خیال رکھوں......" وہ اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

"تو کیا بیٹی کو اپنے بابا کا خیال نہیں کرنا چاہیے۔" اس کی معصومانہ باتوں کو وہ بہت انجوائے کرتے تھے سو اب بھی کھل کر ہنسے۔

"کیوں نہیں میری جان ضرور کرنا چاہیے۔" اور پھر نیچے کارپٹ پر بیٹھی مہراں کی طرف دیکھا۔

"رفیق بھائی سے کہو ایک کپ چائے بنا دیں۔"

"بابا کیا میں بھی چائے پی سکتی ہوں......" اس نے اتنی معصومیت سے پوچھا تو وہ ہنس دیے۔

"ویسے تو بچوں کو دودھ ہی پینا چاہیے لیکن آج تھوڑی سی پی لیں۔" اور پھر وہ چائے پی کر مغرب کی نماز کے لیے اٹھ گئے...... واپس آئے تو وہ صوفے پر بیٹھی تھی آنکھیں بند کیے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے۔

"کیا ہوا میری جان...... ٹی وی نہیں دیکھ رہیں...... طبیعت ٹھیک ہے ناں......؟" وہ اسے یوں بیٹھے دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔

"ٹھیک ہوں بابا...... ٹی وی بند کر دیا تھا۔ رضوانہ باجی کہتی تھیں کہ مغرب کے وقت کوئی فضول کام نہیں کرنا چاہیے اور ٹی وی تو بالکل بھی نہیں لگانا چاہیے اور اذان کو خاموشی سے سننا چاہیے۔"

"سوری بیٹا......!" وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوئے۔ "مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ یہ چھوٹی، چھوٹی باتیں تو مائیں اور نانی، دادی ہی باتوں، باتوں میں بچوں کو بتا دیتی ہیں تو کیا وہ اکیلے کرن کی اچھی تربیت کر سکیں گے...... تو کیا انہیں صبا آنٹی کی طرف سے مایوس ہو کر سبین سے شادی کر لینی چاہیے۔ اور کیا سبین، کرن کی ایسی تربیت کر سکے گی کہ وہ ایک اچھی انسان اور بہترین مسلمان بن سکے......" سوچتے، سوچتے انہوں نے ڈاکٹر داؤد کا نمبر ملایا۔

(جاری ہے)

digest novels lovers group
urdunovels.com

’’جی داؤد بھائی میں نماز پڑھ رہا تھا تو آپ کی کال آ رہی تھی۔‘‘ تیمور نے نماز مکمل کرتے ہی ڈاکٹر داؤد کا نمبر ملایا تھا۔

’’کرن کا ہی پتا کرنا تھا کیسی طبیعت ہے اب اس کی؟‘‘

’’بظاہر بخار تو اب محسوس نہیں ہو رہا...... فریش لگ رہی ہے۔ ویسے چیک نہیں کیا۔‘‘

’’معمولی سے بخار کی بچے پروا نہیں کرتے...... دوا باقاعدگی سے دینی ہے کم از کم تین دن۔‘‘

ڈاکٹر داؤد نے تاکید کی اور وہ ان سے باتیں کرتے ہوئے لاؤنج سے باہر نکل آئے اور پھر سٹنگ میں سے ہوتے ہوئے اندرونی گیٹ سے باہر نکل کر انیکسی کی طرف بڑھ گئے۔ ایک خیال بہت دیر سے ان کے ذہن میں آ رہا تھا تو انہوں نے سوچا ابھی بات کر لیں کہ جو کام جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔ اس نے دروازہ پہلی دستک پر ہی کھول دیا تھا شاید وہ صحن میں ہی موجود تھی۔ شاید وہ صحن کی لائٹ جلانے آئی تھی کیونکہ دروازہ کھول کر وہ واپس مڑی تھی اور لائٹ جلائی تھی۔

’’خالہ مہراں...... وہ......‘‘ بات کرتے کرتے اس نے نظریں اٹھائی تھیں اور لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ پھر اس کے لبوں سے نکلا۔

’’آپ......؟‘‘

’’ہاں میں...... آئندہ بغیر پوچھے اس قدر بے احتیاطی سے دروازہ مت کھولیے گا۔‘‘ انہوں نے صحن میں قدم رکھا۔

’’وہ میں نے سمجھا خالہ جی ہوں گی۔‘‘ وہ گھبرائی سی برآمدے میں کھڑی تھی۔

ناولٹ

ہم تمہارے کھوج میں

نگہت سیما

digest novels lovers group

"میں یہ کہنے آیا تھا کہ اپنا نام، والد کا نام ماسٹر کرنے کا سن اور سال اور جو دوسرے ضروری کوائف ہیں ایک کاغذ پر لکھ کر مہراں کو دے دیں۔ ایک شخص سے بات کی ہے میں نے، اسلام آباد میں، وہ کہہ رہا ہے کہ کر لے گا کچھ۔"

وہ چاہتے تھے کہ اپنی اہلیت کے مطابق اسے کسی پرائیویٹ اسکول یا کالج میں ہی صحیح جاب مل جائے نہ کہ وہ کہیں کسی گھر میں ماسی بن کر رہے۔ انہوں نے کس جذبے کے تحت اس کے لیے یہ سوچا تھا خود ابھی تک اس سے بے خبر تھے۔

"شکریہ سر......"

اس نے پلکیں اٹھائیں اور پھر گرا لیں۔ گھنی پلکوں کے سائے رخساروں پر لرزنے لگے تھے۔ پلکوں کا یہ اٹھنا اور گرنا ان کے دل پر قیامت ڈھا گیا تھا۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ بلب کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ اس روشنی میں نہائی کھڑی کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ وہ تیزی سے مڑے تو اس کی آواز سنائی دی۔ وہ جھجکتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

"سر وہ کرن کیسی ہے، اس کا بخار کم ہوا یا نہیں؟"

"بخار اتر گیا ہے اور ہاں آئندہ کرن کے بہانے یا کسی بھی وجہ سے گھر کے اندر جانے کی ضرورت نہیں ہے؟" انہوں نے اپنے آپ پر آیا غصہ اس پر نکالا۔

"اسی بہانے گھر کی تلاشی لے لی ہوگی۔"

"جی......!" وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ آنکھوں میں یک دم پانی بھر گیا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے یہ شخص کتنا مہربان لگ رہا تھا اور اب......

"سوری سر......میں خود سے نہیں گئی تھی، مہراں خالہ بلا کر لے گئی تھیں۔" ناراضی سے کہتی وہ کمرے کی طرف مڑی۔

"سنیں، مہراں رات کو آجائے گی......جب تک کچھ بندوبست نہیں ہو جاتا کرن کو میں اپنے پاس رکھوں گا۔" بات مکمل کر کے وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ وہ خود اپنی کیفیات کو سمجھنے سے قاصر تھے......کہیں کچھ ایسا تھا جو مختلف تھا۔ وہ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ کہیں کسی خواہش کی کونپل اندر سر اٹھا رہی تھی، دوسراہٹ کی خواہش کسی اپنے کے قریب ہونے کی، پاس ہونے کی خواہش......"تو کیا یہ سبین کی ہر روز فون پر کی جانے والی گفتگو کا اثر ہے۔ تنویر چاچو، دادا جان اور دوسرے لوگوں کے بار، بار سمجھانے کا اثر ہے کہ میں کسی ساتھی کی ضرورت محسوس کرنے لگا ہوں؟" اور اس رات سونے سے پہلے انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں بہت جلد کوئی آخری فیصلہ کر لینا چاہیے۔ تنویر چاچو کو اگر صبا آنٹی کے اس کزن کے متعلق کچھ معلومات نہیں ملتیں تو وہ ایک آخری کوشش کرنے کے بعد میرا بھابی سے اور اسما چچی سے کہیں گے کہ کرن کے لیے وہ شادی کرنے کو تیار ہیں لیکن لڑکی ایسی ہو جو کرن سے محبت کر سکے اسے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دے۔ بظاہر وہ مطمئن سے ہو گئے تھے لیکن نیند آنے تک وہ رخساروں پر لرزتے پلکوں کے سائے اور وہ نم آنکھیں انہیں ڈسٹرب کرتی رہیں۔

اگلے دن ایک وقت دو باتیں ہوئی تھیں۔ ابھی ناشتا ختم کر کے وہ آفس جانے کے لیے اٹھے ہی تھے کہ دادا جان آگئے۔ وہ ان کے اتنے سویرے آنے پر حیران سے ہو گئے۔ رفیق کو ان کے لیے ناشتا بنانے کا کہہ کر وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔

"خیریت دادا جان، اتنے سویرے کیسے آنا ہوا؟"

"اوہ پتر خیریت ہی ہے، عدالت میں ایک کیس لگا ہوا تھا زمین کا، اس کے لیے آنا تھا سوچا تم سے بھی ملتا چلوں......بس ابھی گھنٹے تک نکل جاؤں گا عدالت جانے کے لیے۔" دل ہی دل میں اطمینان محسوس کرتے ہوئے انہوں نے دادا جان کی طرف دیکھا۔

"اب آئے ہیں تو کچھ دن رک جائیں، کرن بہت خوش ہوگی، آپ کو یاد کرتی ہے۔"

"نہ پتر سو بکھیڑے ہیں اُدھر......عدالت سے ہی چلا جاؤں گا۔ تیرا باپ تو پردیس جا کر بیٹھ گیا تھا پھر اُدھر کی ہی مٹی میں دفن ہو گیا۔ سارے بکھیڑے میری

اکیلی جان کے لیے......تنویر کو پہلے تو بہت دلچسپی تھی۔ پتا نہیں پھر کیا ہوا کہ پرے ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑا سا ٹکڑا زمین کا الگ کرلیا ہے بس اسی پر ہی تجربے کرنے میں لگا رہتا ہے۔ باغات سے پھل اتروانے کا وقت آئے تو گاؤں سے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ فقیر درویش ہو گیا ہے، کہتا ہے زمین جائداد کیا کروں گا...... آخر میں تو دو گز زمین ہی نصیب ہونی ہے، تیرا باپ بھی ایسا ہی تھا پاگل، جھلا...... اور ہاں یہ کرن کدھر ہے۔ اسکول تو نہیں چلی گئی؟''

''اسے کل سے بخار ہے سو رہی ہے۔ ابھی مہراں جگا کر لے آتی ہے اسے۔'' دل ہی دل میں انہوں نے شکر ادا کیا کہ دادا جان نے یہاں رہنے کی ہامی نہیں بھری تھی ورنہ بہت مشکل ہو جاتی۔

''اور تم غالباً آفس جانے کے لیے تیار تھے۔ اور کرن کو بس مہراں کے آسرے پر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ بچی بیمار ہے، زیادہ طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں شادی کرلو...... کرن کی دیکھ بھال کے لیے کوئی عورت تو ہو گھر میں۔'' دادا جان کو موقع مل گیا تھا اس موضوع پر بات کرنے کا......

''میں کل آفس سے چھٹی لے کر آ گیا تھا دادا جان...... آج بھی بس تھوڑی دیر کے لیے جا رہا تھا اور کرن کا بخار اب کم ہے چیک کیا تھا میں نے صبح۔'' وہ اپنے آفس میں فون کر کے ایک کولیگ سے بات کرنے لگے کہ ان کے دادا جان آئے ہوئے ہیں تو وہ کچھ دیر سے آفس آئیں گے جی ایم کو بتا دے وہ...... دادا جان جو بغور انہیں دیکھ رہے تھے ان کے فون بند کرتے ہی بولے۔

''یہ چند ٹکوں کے لیے کیوں غلامی کر رہا ہے دوسروں کی، روپے پیسے کی کمی تو نہیں ہے...... وہ زمین، باغات سب کچھ تو تم لوگوں کا ہی ہے۔ حویلی میں آکر رہو، تم اور کرن وہاں آکر رہو گے تو رونق ہو جائے گی۔ تیرے چاچے کے پاس تو دو گھڑی اپنے باپ کے پاس بیٹھنے کو وقت ہی نہیں، جانے کن کمسن کھیریوں میں پڑا رہتا ہے۔ اور تیری چاچی وہ بھی بس اللہ لوک ہی ہے۔

اتنی زمین جائداد کی اکلوتی مالک اور غریبوں کی طرح رہتی ہے۔ بیٹا لیا تھا کسی کا اور اسے بھی غیر ملک میں بھیج رکھا ہے۔ چلو غیر خون ہے، وارث نہیں ہے پر دل تو بہلائے رکھتا ان کے، کچھ خدمت بھی کرتا ان کی...... ہاں تو پھر تیرا کیا ارادہ ہے؟''

''کیسا ارادہ دادا جان؟'' ان کی بات سنتے، سنتے وہ چونکے۔

''یہ ہی سین سے شادی کا...... اب آیا ہوا ہوں ادھر تو یہ بھی بتا جاؤں اس کے پیو (باپ) سے بات کر جاؤں تیرے رشتے کی۔'' انہوں نے گہری نظروں سے انہیں دیکھا۔

''نہیں...... میں آپ کو بتا چکا ہوں دادا جان کہ مجھے سین سے شادی نہیں کرنی۔'' انہوں نے صاف اور دوٹوک بات کی۔

''وہ بہت اچھی ہے لیکن میرے ساتھ چل نہیں سکتی...... میں اسے خوش نہیں رکھ سکوں گا......''

''ہوں...... لگتا ہے کہ تیرے تایا کی بیوی اور بیٹی مل گئی ہے تجھے، تو کرلے اس سے ہی شادی، میں نے تو کہا تھا کہ......'' وہ بولے۔

''شاہ میر مر چکا ہے اور اب تنہا وارث وہ ہی ہے تو کرلے اس سے ہی شادی، سب کچھ زمینیں، باغات خودبخود ہمارے ہو جائیں گے کسی ہیرا پھیری کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔'' کچھ سوچ کر وہ مسکرائے تو تیمور جزبز سے ہوئے۔

''پتا نہیں یہ خیال آپ کے دماغ میں کہاں سے آ گیا ہے کہ میں پاکستان ان لوگوں کو تلاش کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

''بچہ نہیں ہوں میں تیمور...... سب جانتا ہوں میں، ازمیر سے بات کی تھی میں نے سین کے اور تیرے رشتے کی لیکن اس نے کہا کہ وہ تمہاری شادی شاہ میر کی بیٹی سے کرے گا کہ اس نے شاہ میر سے وعدہ کر لیا تھا۔ اور تو جو یہاں آکر بیٹھا ہوا ہے ناں تو اسے ہی ڈھونڈنے آیا ہے۔ مل گئی ہے کیا؟'' بالکل غیر ارادی

digest novels lovers group

طور پر اس کا سر نفی میں ہلا تھا۔
''تو پھر وہ کڑی (لڑکی) کون ہے جسے انیکسی میں رکھا ہوا ہے؟'' دادا جان کو گھما پھرا کر بات کرنے کی عادت تھی۔ آدھے گھنٹے سے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے اور آنے کا اصل مقصد اب ظاہر ہوا تھا۔ تیمور ذرا سی دیر کے لیے گھبرا گئے تھے لیکن فوراً ہی سنبھل گئے۔
''رفیق بھائی کی بھانجی ہے، اپنے گاؤں سے یہاں نوکری کی تلاش میں آئی ہے۔ ابھی تک اسے اپنے مطلب کی جاب نہیں ملی، تعلیم یافتہ ہے۔ رضوانہ کے جانے کی وجہ سے کرن کچھ اپ سیٹ ہو گئی تھی تو میں نے اسے کرن کے لیے رکھ لیا ہے۔ میری عدم موجودگی میں کرن کی دیکھ بھال بھی کرے گی اور اسے پڑھا بھی دیا کرے گی۔'' بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کچھ کام خود بخود ہو جاتے ہیں وہ کام جو ہم کرنا بھی نہیں چاہتے...... وہ بھی اسے کرن کی دیکھ بھال کے لیے کسی صورت نہیں رکھنا چاہتے تھے لیکن......
''یہ عارضی سہارے کب تک تیمور علی...... سوچ لے بوڑھا ہو کر شادی کرے گا کیا......؟'' تب ہی مہراں نے ناشتا لگنے کی اطلاع دی۔
''ویسے تو فجر ویلے (وقت) میں نے تھوڑا بہت ناشتا کر لیا تھا۔ پر خیر پھر دو چار لقمے لے لیتا ہوں...... پتا نہیں عدالت میں کتنی دیر لگ جائے۔'' وہ اٹھے اور پھر مہراں کی طرف دیکھا۔
''میں ناشتا کر لوں تو ذرا اس کڑی کو بھی بلا لانا۔'' مہراں کی سوالیہ نظریں لمحہ بھر کے لیے تیمور علی کی طرف اٹھیں۔
''کرن کی دیکھ بھال اور پڑھانے کے لیے جو لڑکی ملازم رکھی ہے۔ دادا جان اس کے لیے کہہ رہے ہیں۔ تاشی بی بی کو......'' انہیں اچانک ہی یاد آیا تھا کہ مہراں اسے تاشی بی بی کہہ رہی تھی۔
''اور باہر ڈرائیور وغیرہ کے لیے ناشتا بھجوا دیا ہے؟''
''جی...... بس رفیق بھائی بھجوانے لگے ہیں۔ کریم نے بتایا تھا تین بندے ہیں۔'' مہراں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں تسلی دی کہ وہ ان کی بات سمجھ گئی ہے۔
''ڈرائیور اور گارڈ کے علاوہ منشی بھی ہے ساتھ۔'' دادا جان نے ڈائننگ ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے بتایا۔
اور ناشتا کر کے جب وہ لاؤنج میں آئے تو مہراں اسے بلا لائی تھی۔ بڑے سے دوپٹے کو اچھی طرح لپیٹے وہ سلام کر کے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی تھی۔
''ہوں تو تم ہو کرن کی ٹیچر اور نگران......'' دادا جان نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔
''جی......'' اس نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔
''سنو لڑکی ہماری بچی کو جھڑکنا یا ڈانٹنا، ڈپٹنا نہیں ہے، پیار اور محبت سے اس کا خیال رکھنا ہے۔''
''جی، کرن تو اتنی پیاری بچی ہے کہ خود بخود اس پر پیار آتا ہے۔'' اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔
''ماشاءاللہ......!'' دادا جان کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔
''تمہارے والد کیا کرتے ہیں، تم اکیلی یہاں نوکری کرنے چلی آئی ہو......؟''
''والدین حیات نہیں ہیں جی...... وہ جی ماموں کے پاس تھی میں۔''
''اچھا، اچھا ٹھیک ہے، شادی وادی کیا نہیں ہوئی تمہاری......؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا تھا لیکن رخساروں پر سرخی بکھر گئی تھی۔ پلکیں ہولے، ہولے لرزنے لگی تھیں۔ دادا جان کے پاس بیٹھے تیمور علی نے عین اسی لمحے سر اٹھایا تھا اور اس کے چہرے پر پھیلتی شفق کو دلچسپی سے دیکھا۔
''رشتہ وغیرہ بھی نہیں کیا ابھی تک تیرے ماموں نے؟'' دادا جان کے سوالات کا سلسلہ جاری تھا۔
اس نے پھر نفی میں سر ہلایا اور رخساروں پر بکھری شفق اور گہری ہو گئی۔
''سنو لڑکی......'' دادا جان اب بھی تنقیدی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔
''تمہیں تمہارے مطلب کی جاب مل گئی تو کیا تم

چلی جاؤ گی یہاں سے؟''

''جاب اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے سر......

اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔

''جاب ملے یا نہ ملے...... جب تک تیمور اور کرن یہاں ہیں...... تم نے ادھر سے نہیں جانا...... پہلے بھی بچی رضوانہ کے چلے جانے سے بہت اداس ہو گئی تھی۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ مانوس ہو جائے تو تم بھی چلتی بنو...... ایک استانی کی جتنی تنخواہ ہوتی ہے اس سے دُگنی تنخواہ ملے گی تمہیں، کیا خیال ہے تمہارا......؟''

وہ سبین کے مزاج کو جانتے تھے بہت لاڈلی اور نازک مزاج تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے کسی بچے کو پیار کر لینا اور بات ہے لیکن مستقل کرن جیسی حساس بچی کا دھیان اور خیال رکھنا اس کے لیے مشکل ہی ہوگا...... یہ لڑکی ہو گی تو کرن کو سنبھالے رکھے گی اور سبین پر بوجھ بھی نہیں ہوگا...... یہ انہیں یقین تھا کہ سبین کے ساتھ شادی کی صورت میں تیمور علی باہر نہیں جائے گا...... کیونکہ سبین صاف، صاف کہتی تھی کہ باہر کی زندگی بہت مشکل ہے...... سارے کام خود کرنے پڑتے ہیں اس لیے میں جس سے شادی کروں گی وہ پاکستان میں ہی رہے گا...... کرن کی وجہ سے وہ سبین اور تیمور کی شادی کے حق میں نہیں تھے لیکن بیٹی نے مجبور کر دیا تھا۔ البتہ اسفند کی موت سے پہلے خود ان کی یہی خواہش تھی۔

''جی...... میں نے کہاں جانا ہے...... کام ہی کرنا ہے تو یہاں ہی کرتی رہوں گی۔''

''ٹھیک ہے جاؤ اب تم......'' وہ چلی گئی اور تیمور نے کب کی رکی ہوئی سانس آزاد کی۔

''اسے تم نے انیکسی میں رکھ چھوڑا ہے تو کیا یہ کرن کو بھی اُدھر لے جاتی ہے؟'' اب دادا جان کو ایک اور خیال آیا تھا۔

''میرے آفس جانے کے بعد جب کرن آجاتی ہے اسکول سے تو یہ گھر کے اندر آجاتی ہے۔ پھر رات کو جاتی ہے واپس......''

''یہ دادا جان بھی ناں اب بال کی کھال اتاریں گے۔'' تیمور علی بیزار ہوئے۔

''اسے تو کرن کے پاس رہنا چاہیے کرن کے روم میں جیسے رضوانہ رہتی تھی۔ کرن ابھی بہت چھوٹی ہے صرف چھ سال کی۔'' انہوں نے رائے دی۔

''جی لیکن مجھے مناسب نہیں لگتا۔ رات کو مہراں ہوتی ہے کرن کے پاس اور کبھی میں اسے اپنے روم میں ہی سلا لیتا ہوں۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے، کُڑی رج کے سوہنی ہے ویسے۔'' وہ مسکرائے تھے۔

''یہ دادا جان نے بھی بہت دھیان سے دیکھا ہے اسے۔'' تیمور علی نے سوچا۔ دادا جان کسی حد تک مطمئن سے ہو کر گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ بھی مہراں کو کرن کا اچھی طرح خیال رکھنے کا کہہ کر آفس چلے گئے تھے۔ آفس سے بھی دو بار فون کر کے کرن کا حال پوچھا اور پھر اس سے بات کی تھی۔ وہ ٹھیک تھی۔

اور شام کو دوسری بات جو ہوئی وہ یہ تھی کہ یمیرا بھابی، ڈاکٹر داؤد کے ساتھ اسے لینے آگئیں۔

''لو یار تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ یمیرا کی دوست بخوشی اسے رکھنے کو تیار ہے...... ہم اسے لینے آئے ہیں...... تمہاری ان چاہی مہمان کو۔'' ڈاکٹر داؤد نے ان کے کندھے پر ہاتھ مارا تو لمحہ بھر کے لیے وہ ششدر سے رہ گئے۔

انہیں لگا جیسے ان کی کوئی بہت قیمتی متاع ان سے چھنی جا رہی ہو جیسے دل بالکل خالی ہو گیا ہو.........

غیر ارادی طور پر ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ ''نہیں......''

''نہیں...... کیا مطلب؟'' ڈاکٹر داؤد حیران ہوئے۔

''تم تو اسے گھر سے نکالنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں تمہاری...... جیسے ہی یمیرا آئی میں نے اس سے

digest novels lovers group

کہا۔ چل یار پہلے اپنی فرینڈ سے بات کر...... تیمور اس کی وجہ سے بہت ٹینس ہو رہا ہے تو کیا بتاؤں وہ کتنی خوش ہوئی کہتی تھی اب اسے اپنی بچی کو ڈے کیئر سنٹر میں نہیں چھوڑنا پڑے گا۔ جاب کرتی ہے ناں وہ......"

"میری دوست بہت اچھی اور قابلِ اعتبار ہے...... وہاں اس لڑکی کو پریشانی نہیں ہوگی۔" سمیرا نے یقین دلایا اس نے سمجھا تھا شاید تیمور کو اعتبار نہیں آرہا اس کی دوست پر......

"یہ بات نہیں بھابی وہ دراصل دادا جان نے اسے کرن کی دیکھ بھال کے لیے رکھ لیا ہے۔ وہ اسے پڑھائے گی بھی اور دیکھ بھال بھی کرلے گی۔" انہوں نے خود کو کمپوز کرلیا تھا۔

"کیا مطلب......؟ دادا جان......؟" ڈاکٹر داؤد نے آنکھیں پھاڑیں۔

"دادا جان کو کیسے پتا چلا اس کے متعلق......؟"

"معلوم نہیں......" اب وہ ریلیکس ہو کر بیٹھے تھے۔ "جیسا کہ میرا خیال ہے کریم نے ہی خبر دی ہوگی۔"

"تمہیں دادا جان کا ہی خوف تھا ناں یار...... تو ٹھیک ہے انہیں اعتراض نہیں ہے تو میرے خیال میں کرن کے لیے اس سے بہتر کوئی دیکھ بھال کرنے کے لیے نہیں مل سکے گی۔" ڈاکٹر داؤد خوش ہوگئے تھے۔ وہ تو شروع سے دن سے چاہتے تھے کہ یہ مصیبت کی ماری لڑکی در، در دھکے نہ کھائے...... ایک محفوظ پناہ گاہ اسے مل جائے۔

"سمیرا اپنی دوست سے معذرت کرلے گی کہ اس لڑکی کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔"

"خیر وہ کوئی بات نہیں، بتادوں گی میں اسے...... یہ بتائیں اب کرن کیسی ہے؟"

"کرن کو ٹمپریچر تو اب بھی ہے ہنڈرڈ تک۔ کچھ دیر پہلے ہی سوئی ہے...... داؤد بھائی کب تک کرن مکمل ٹھیک ہو جائے گی؟" اب وہ کچھ پریشانی سے پوچھ رہے تھے۔

"ان شاء اللہ کل تک بخار بالکل اتر جائے گا لیکن ایک دو دن اسکول مت بھیجنا اسے۔"

تیمور نے سر ہلایا تب ہی مہراں جوس لے کر آگئی۔

"مہراں ذرا کرن کو دیکھ آؤ جا کر سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے...... اور پھر رفیق بھائی سے چائے کے لیے کہہ دینا۔"

مہراں سر ہلا کر چلی گئی تو ڈاکٹر داؤد کو اسفند کا خیال آیا۔ کبھی، کبھی یوں ہی اچانک اسفند انہیں یاد آجاتے تھے۔

"ہم دونوں چائے کے بہت دیوانے تھے...... شدید گرمی میں جب سب ٹھنڈے مشروب پی رہے ہوتے تھے تو ہم چائے یا کافی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ شروع کے سالوں میں ہمارے ہاسٹل کے کمرے میں ہم تین لڑکے تھے تیسرا اعلیٰ احمد، آدھی رات کو ہمارے کافی بنا کر پینے سے بہت چڑتا تھا۔ آخر کمرا چھوڑ گیا۔" وہ ہولے سے ہنسے تھے۔

اسفند کا ذکر چلا تو ایک سے ایک بات نکلتی گئی۔ اس دوران چائے بھی لوازمات کے ساتھ پی گئی تھی۔

"پتا ہے ان دنوں ہم ناران، کاغان گئے ہوئے تھے جب تمہارے بابا کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اسفند سے کہا تھا کہ وہ فوراً اپنے شاہ میر تایا سے ملیں جو لاہور میں ہی کسی اسپتال میں ایڈمٹ تھے۔ تمہارے بابا اتنے پریشان تھے کہ اسفند فوراً ہی واپس چلا گیا۔ حالانکہ ہمیں ابھی آگے جانا تھا دس دن کا ٹور تھا۔"

"ہاں......" تیمور علی کو یاد تھا۔ جب شاہ میر تایا کا فون آیا تھا تو بابا کتنے بے چین اور مضطرب تھے...... دو، دو، تین بار دن میں انہیں فون کرتے تسلی دیتے کہ جیسے ہی ان کا چیک اپ ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر انہیں سفر کی اجازت دیتے ہیں وہ اسی روز سیٹ بک کروا لیتے ہیں اور اگر خود نہ آسکے تو تیمور کو بھیج دیں گے۔ اسفند کو سب سمجھا دیا۔ اگر شاہ میر تایا اپنی قسم دے

کرانہیں ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر آنے کو منع نہ کرتے تو شاید وہ بغیر چیک اپ کروائے اور ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود اسی روز پاکستان روانہ ہو جاتے لیکن شاہ میر تایا کی قسم کی وجہ سے وہ مجبور ہو گئے تھے..... شاہ میر تایا نے ان سے کہا تھا۔

"تمہیں یاد ہے ناں میرو، اماں نے کیا وعدہ لیا تھا مجھ سے..... جب ہم چھوٹے تھے اور اسکول جاتے تھے تو اماں ہر روز صبح مجھے اسکول جانے سے پہلے تاکید کرتی تھیں۔ "میرو کا وہاں بہت خیال رکھنا..... تمہیں پتا ہے ناں اس کا دل بہت کمزور ہے، زیادہ بھاگ دوڑ نہ کرنے دینا....." اور میں تو گیٹ سے تمہارے روم تک تمہارا بیگ اٹھا کر چلتا تھا تو اب کیسے میرو اپنے لیے اماں کی تاکید بھول جاؤں..... اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ دل کے مریض کے لیے جہاز کا سفر خطرناک ہوتا ہے بس جب ڈاکٹر اجازت دیں تب ہی آنا..... ابھی اتنی جلدی تو نہیں مرنے والا..... ڈاکٹروں نے بتایا ہے ناں تین ماہ زیادہ سے زیادہ....." اور تب بابا بہت روئے تھے۔

"اب اتنی دور سے میں تمہیں گلے لگا کر تمہارے آنسو تو نہیں پونچھ سکتا..... بس اب نہیں رونا..... پتا نہیں میری غلطی تھی کہ میں تم لوگوں سے چھپ گیا، چھوڑ دیا یا تقدیر میں ہی یہ جدائیاں لکھی تھیں..... تم نے جو کہا ہے ناں تیمور کو پہلے بھیج دو گے تو ٹھیک ہے یار اسے ہی بھیج دو۔ دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے..... اسفند تو بالکل تمہاری کاپی ہے۔ بہت ہی با ادب اور محبت کرنے والا بچہ ہے..... اس کا فائنل ایئر ہے پھر بھی وقت نکال کر چکر لگاتا ہے۔"

بابا کی عادت تھی وہ شاہ میر تایا سے ہونے والی ہر بات تیمور کو بتاتے تھے اور اس روز ساری بات بتا کر انہوں نے اس سے کہا تھا۔ "تیمور تم پاکستان جانے کی تیاری کرو اور جو فلائٹ بھی ملتی ہے اس پر سیٹ بک کروالو....." اور وہ حیران ہوئے تھے۔

"لیکن بابا میں کیوں..... آپ کو پتا ہے میرا سمسٹر چل رہا ہے۔ میں کوئی لیکچر مس نہیں کر سکتا....."

"تم چار دنوں کے لیے چلے جاؤ تیمور..... اس طرح سیٹ بک کروا لو کہ ایک دو چھٹیاں ساتھ مل جائیں۔ اس طرح زیادہ لیکچر مس نہیں ہوں گے..... سنڈے اور منڈے کو تمہاری کلاس نہیں ہوتی ناں تو جمعرات..... یا جمعہ کی سیٹ بک کروا لو..... سنڈے کو واپس آ جانا۔"

"لیکن بابا....." اس نے اعتراض کیا تھا۔ "میں تو زندگی میں کبھی ان سے نہیں ملا..... میرے دل میں ان کے لیے وہ محبت نہیں ہے جو آپ کے دل میں..... آپ ان کے لیے تڑپ رہے ہیں تو آپ....."

"میں تمہارا نکاح شاہ میر کی بیٹی سے کر رہا ہوں..... میں نے وعدہ کیا ہے شاہ میر سے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے بہت پریشان تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اس کی بیٹی رُل جائے گی..... صبا بھابی کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے..... ان کا کوئی بہن، بھائی بھی نہیں ہے تو..... شاہ میر نے زندگی میں پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا ہے..... اس نے کہا ہے "میرو میری آخری سانسوں کو سہل کر دو....." میں تو مر کر بھی ابا جان کی زیادتیوں کی تلافی نہیں کر سکتا جو انہوں نے اس کے ساتھ کیں..... آج اگر اس کا بیٹا ہوتا تو ماں اور بہن کا سہارا ہوتا۔ ابا جان نے اس کا بیٹا چھینا تھا میں اپنا بیٹا اسے دینا چاہتا ہوں..... وعدہ کرو تیمور، تم شاہ میر کے ساتھ کیے میرے وعدے کی لاج رکھو گے....." اور وہ الجھ سے گئے تھے یہ نہیں تھا کہ وہ کسی لڑکی کو پسند کرتے تھے ابھی تو انہوں نے اس کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا۔

"اگر اسفند کا رشتہ آمنہ کے ساتھ نہ ہو چکا ہوتا تو میں اس سے کہتا..... مجھے شاہ میر کے سامنے شرمندہ مت ہونے دینا تیمور....." اور انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔

"ٹھیک ہے بابا، میں بات کرتا ہوں پروفیسر ایرک سے اور پھر فلائٹ کا بھی پتا کرتا ہوں..... لیکن

digest novels lovers group

مجھے آپ کی فکر رہے گی۔'' اور وہ جیسے پُرسکون سے ہو گئے تھے۔

''تمہاری اماں ہے ناں فکر مت کرو......بس جانے کی تیاری کرو یار......'' اور ابھی وہ چھٹی لینے کے بعد فلائٹ کا پتا کر ہی رہے تھے کہ اسفند کا فون آ گیا تھا شاہ میر تایا چلے گئے...... اور پھر بابا کی طبیعت خراب ہوگئی......ان کا بیمار دل یہ صدمہ برداشت ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ شاہ میر ان سے ملے بنا چلے گئے۔

''نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے تیمور اتنے سالوں بعد بھائی سے ملنے کی نوید ملی اور......'' وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر روتے رہتے۔ ڈاکٹر، تیمور کو ان کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرنے دیتے تھے۔ شاہ میر کی ڈیتھ کی خبر سننے کے بعد ان کی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ انہیں اسپتال ایڈمٹ کروانا پڑا تھا۔ پھر انہیں سنبھلنے میں بہت دن لگے تھے۔ اسفند سے ان کا رابطہ تھا اور اسفند انہیں تسلی دیتا تھا کہ وہ چچی کا خیال رکھ رہا ہے۔ یہ تو جب وہ (تیمور علی) پاکستان آئے تو پتا چلا تھا کہ شاہ میر تایا کی فیملی کہیں چلی گئی ہے......اور پھر بابا نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ انہیں تلاش کریں گے...... وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی ان سے وعدہ لے رہے تھے کہ وہ اپنی آخری حد تک انہیں تلاش کریں گے۔ اسفند اور بابا کی یادوں نے انہیں بے قرار سا کر دیا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ ضبط کیے ڈاکٹر داؤد کی باتیں سن رہے تھے۔

''اسفند کو بھلانا آسان نہیں ہے یار...... تمہارا تو وہ بھائی تھا۔ تمہارے درد اور تکلیف کو سمجھ رہا ہوں۔ سوری یار میں نے اسفند کا ذکر کر کے تمہیں بھی پریشان کر دیا۔'' انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''اپنے پیاروں کو یاد کرنے کے لیے ان کا ذکر سننا ضروری نہیں ہوتا داؤد بھائی، وہ بھولتے کب ہیں...... ہر لمحہ ہر آن یاد آتے ہیں...... یہ اللہ تعالیٰ ہے جو ہمیں صبر عطا فرماتا ہے......حوصلہ دیتا ہے اس دکھ کو برداشت کرنے کا۔'' ان کے آنسو ان کے اندر گر رہے تھے...... لیکن اس رات جب وہ کرن کے پاس آ کر لیٹے تو اس کے معصوم چہرے کو دیکھتے ہوئے ان کی آنکھیں برس پڑی تھیں۔ بہت دنوں بعد وہ یوں سب کو یاد کر کے روئے تھے کہ خود پر اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ کاش وہ بابا کے ساتھ کیا عہد نبھا پاتے، سرخرو ہو جاتے لیکن شاید اللہ کو ہی یہ منظور نہیں تھا۔ بہت دیر تک انہیں نیند نہیں آئی تھی لیکن سونے سے پہلے جو خیال ان کے تصور میں آیا تھا وہ اس کا تھا اور انہوں نے سوچا تھا کہ وہ صبح آفس جانے سے پہلے اس سے بات کر کے جائیں گے کہ یقیناً اس نے یہ ہی سمجھا ہوگا کہ یہ صرف دادا جان کی بات تھی اور تیمور علی اسے کرن کی دیکھ بھال کے لیے نہیں رکھیں گے اور ایسا ہی تھا۔ صبح جب اس سے بات کی تو وہ حیران ہی رہ گئی۔

''آپ کا مطلب ہے کہ میں کرن......؟''

''ہاں میرا یہی مطلب ہے...... جو دادا جان نے کہا ہے۔ آپ ایسا ہی کریں گی۔ ہاں اگر آپ نے خود کہیں جانا چاہا تو......'' انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور دل میں عجیب طرح سے ہلچل ہوئی۔ یہ لڑکی پتا نہیں کیوں ان کی نظر میں بے اعتبار ہونے کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی دل کی دنیا اتھل پتھل کر دیتی تھی۔ کیا وہ اس کے حسن سے متاثر ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ ایسے حسن پرست تو کبھی نہ تھے۔ کتنی ہی حسین لڑکیاں ان کی ہم جماعت تھیں لیکن انہوں نے کبھی ان کی طرف دھیان نہیں دیا تھا تو کیا پھر یہ محض ہمدردی ہے...... جو دل کے کسی گوشے میں اس کے لیے موجود ہے۔ اور جس انسانی ہمدردی کے تحت انہوں نے نہر میں چھلانگ لگائی تھی۔

''میں کیوں جانا چاہوں گی کہیں؟'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''آج کل تو کرن گھر پر ہی ہے تو آپ ابھی اس کے پاس چلی جائیں۔ اگرچہ اس وقت میں نے چیک کیا ہے ٹمپریچر نہیں ہے۔ پھر بھی دن میں ایک بار چیک

کر لیجیے گا۔ اور باقی سب کچھ مہراں آپ کو سمجھا دے گی۔'' اب وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

''اور اسی بہانے اگر میں نے سارے گھر کی تلاشی لے لی تو......؟'' وہ بھی مناشہ شاہ میر تھی...... ادھار تو رکھتی ہی نہیں تھی۔ یہ تو حالات تھے جنہوں نے اس سے اس کا سارا اعتماد چھین لیا تھا۔ گو اس نے فوراً ہی زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔ تیمور نے اپنی... بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپایا اور چہرے کے تاثرات کو سخت کیا۔

''میں دادا جان کا حکم نہیں ٹال سکتا۔'' ایک نظر اس پر ڈال کر تیز، تیز چلتے ہوئے وہ انیکسی سے نکل کر پورچ کی طرف بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

آج اتوار تھا اور وہ ناشتے کے بعد لاؤنج میں ہی بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ نظریں بظاہر اخبار پر تھیں لیکن ذہن کہیں اور تھا۔ ستمبر کے آخری دن تھے اور ان دنوں موسم بے حد خوشگوار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی سیین کا فون آیا تھا۔

''آج موسم بہت اچھا ہے...... ہمارے بچے سیر کے لیے لاہور جا رہے ہیں...... اگر اجازت ہو تو کرن کو بھی ساتھ لے جائیں...... یہ میں نے نہیں خالہ جان نے مجھ سے کہا ہے۔'' لہجہ طنزیہ تھا لیکن انہوں نے نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔

''اول تو کرن کا موڈ نہیں ہے...... دوم شام کو ہمیں ڈاکٹر داؤد کے بچے کی برتھ ڈے پارٹی میں جانا ہے اور وہ تو ابھی سے وہاں جانے کے لیے بہت ایکسائٹڈ ہو رہی ہے۔''

''کرن کا یا آپ کا موڈ نہیں......؟'' لہجہ ہنوز طنزیہ تھا۔ ''خیر آپ کی مرضی......''

اس نے فون بند کر دیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ کچھ دنوں سے سب کے رویے کچھ اکھڑے، اکھڑے سے تھے اور سیین جب بھی فون کرتی کوئی نہ کوئی طنز ضرور کرتی تھی لیکن فون کرنے سے بھی باز

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اپریل 2024ء کی جھلکیاں

باہمت دوشیزہ

پاکستان کے دور افتادہ علاقے کی لڑکی نے ناممکن کو ممکن بنا دیا

قابلِ فخر

وہ شخصیت۔ جو وطن کی محبت میں ہالی ووڈ والوں کے روکنے پر نہ رکا

نایاب

پاکستانی فلموں سے جڑے نایاب لوگوں کا ذکر خاص

اسیرِ جنوں

رگوں میں لہو تیز کر دینے والی طویل کہانی

کاروانِ زیست

معروف فنکار طاہر جاوید مغل کی آپ بیتی

رشتۂ محبت

ایک ڈگر سے ہٹ کر کی گئی محبت پر مبنی سچ بیانی

اس کے علاوہ

اور بھی بہت کچھ، بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات جو سرگزشت کا خاصہ ہے

نہیں آتی تھی۔ سب سے زیادہ اعتراض اسے مناشہ پر تھا۔

”آپ نے تو دعویٰ کیا تھا کہ آپ اور مہراں، کرن کی اچھی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ پھر اس خاتون کی موجودگی کی وجہ؟“

”یہ دادا جان کا فیصلہ ہے بیگن......“ انہوں نے سب کچھ دادا جان پر ڈال دیا تھا اور یہ تھی بھی حقیقت اگر دادا جان نہ کہتے تو شاید خواہش کے باوجود وہ اسے نہ رکھتے۔

”مناشہ......“ انہوں نے زیرِ لب دُہرایا۔

جب کرن نے انہیں خوشی، خوشی بتایا تھا۔

”بابا یہ تو وہی پری ہیں جو اس روز میرے کمرے میں آئی تھیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ یہ پری ہیں لیکن یہ مناشہ باجی ہیں...... رضوانہ باجی کی طرح اب یہ میرے پاس رہیں گی اور یہ تو ان سے بھی اچھی ہیں۔“ اور نام سن کر وہ چونکے تھے۔ اس نام نے ان کی زندگی کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ جو کبھی پاکستان نہیں آنا چاہتے تھے اس نام کی لڑکی کے کھوج میں دو سال سے یہاں بیٹھے تھے۔ اسفند بھائی نے بتایا تھا۔

”اس کا نام مناشہ ہے...... ابھی کم عمر ہے، سولہ، سترہ سال کی ہوگی...... بہت پیاری اور انوسنٹ ہے...... جب تایا ابا نے میرا تعارف کروایا اور اسے بتایا کہ میرے ساتھ اس کا دُہرا رشتہ ہے کہ مستقبل میں وہ اس کا رشتہ میرے چھوٹے بھائی سے کرنے والے ہیں پہلے تو وہ حیران ہوئی پھر اس کے چہرے پر حیا کے جو رنگ بکھرے تھے۔ حیا، پاکیزگی اور خوب صورتی کا یہ امتزاج اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ بس بے فکر ہو کر آنکھیں بند کر کے اس کے نام کو اپنے دل میں سجالو......“ اور خود بخود یہ نام ان کے دل پر کھُد گیا تھا۔

”لیکن بھائی وہ اتنی کم عمر ہے، بابا نے یہ تو بتایا ہی نہیں......“

”تو یار تم کون سا بوڑھے ہو...... بیس سال کے ہی تو ہوا بھی۔ ابھی تو بس شاہ میر تایا اور بابا تمہارا اور اس کا نکاح ہی کرنا چاہتے ہیں۔ شادی تو تم دونوں کی تعلیم کے بعد ہی ہوگی ناں...... میری اور آمنہ کی عمر میں تو پانچ سال کا فرق ہے۔ تمہارا اور اس کا تین ساڑھے تین سال کا ہوگا......“ اور وہ مطمئن سے ہوگئے تھے لیکن پھر مناشہ ...... دنیا کے کس کونے میں جا کر چھپ گئی تھی۔ اور یہ مناشہ...... انہیں لگنے لگا تھا کہ ان کی سب حفاظتی دیواریں اور شخصیت کا خول توڑ کر ایک دم سے زبردستی ان کی ذات میں گھس آئی تھی۔

گزرے تین ماہ میں جس طرح اس نے کرن کا خیال رکھا تھا۔ اس کی پڑھائی، اس کی دینی تعلیم جس کا خود سے انہیں خیال ہی نہیں آیا تھا اس کے پوچھنے پر کیا کوئی قاری یا قاریہ آتی ہیں کرن کو پڑھانے تو وہ نادم سے ہوگئے تھے۔

”میں میرا بھابی سے کہتا ہوں......“

”نہیں سر اس کی ضرورت نہیں ہے...... میں نے تجوید کے ساتھ قرآن شریف پڑھا ہے...... میں خود پڑھا لوں گی...... بس آپ سے پوچھنا تھا۔“

اور جو چھوٹی، چھوٹی باتیں کرن سیکھ رہی تھی...... وہ تو خود شاید کبھی اسے سکھا نہ پاتے اور اس کے لیے وہ اس کے ممنون تھے۔ اور کرن تو اس کی دیوانی تھی...... مناشہ باجی نے یہ کیا، مناشہ باجی نے یہ بتایا...... اس کے پاس اس کی باتوں کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ کئی بار وہ جھنجلا جاتے...... وہ اس کی باتیں سننا بھی چاہتے تھے اور نہیں بھی۔

”بیٹا کوئی اور بات کرو......“

”اور کیا بات کروں بابا...... بس آپ مجھ سے پرامس کریں انہیں کبھی جانے نہیں دیں گے رضوانہ باجی کی طرح......“

”لیکن اگر انہوں نے خود جانا چاہا رضوانہ کی طرح تو ہم انہیں روک تو نہیں سکیں گے ناں......“ انہوں نے سمجھانا چاہا تو وہ اپنی خوب صورت آنکھوں

digest novels lovers group

میں آنسو بھر لائی تھی۔

''نہیں، آپ پرامس کریں کہ آپ انہیں نہیں جانے دیں گے۔''

''لیکن میری جان ہم انہیں کیسے روک سکتے ہیں۔ کسی کے ساتھ زبردستی تو نہیں کر سکتے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں انہیں خود کہہ لوں گی اور وہ میری بات کبھی بھی نہیں ٹالتیں۔'' ان کی بے بسی دیکھ کر اس نے خود ہی فیصلہ سنا دیا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے ابھی تو وہ نہیں جا رہی ناں جب جانے لگیں تو پھر روک لینا۔''

''ٹھیک ہے......'' وہ سر ہلا کر چلی گئی تھی۔

دادا جان نے اس دوران دو چکر لگائے تھے کرن سے مل کر اور نتاشہ سے کرن کے متعلق باتیں کر کے وہ چلے گئے تھے کہ دونوں بار اپنے کام سے ہی آئے تھے لیکن ان کا رویہ نارمل تھا، دوبارہ انہوں نے شادی کی بات بھی نہیں کی تھی۔ شاید وہ چھ ماہ گزرنے کا انتظار کر رہے تھے اور تین ماہ تو گزر بھی گئے تھے...... پھر چھ ماہ بعد کیا ہوگا...... ابھی تک صبا آنٹی وغیرہ کا پتا نہیں چلا تھا۔ تنویر چاچو بھی ناکام رہے تھے۔ اور تین ماہ بعد انہیں بہر حال واپس چلے جانا تھا۔ کرن جو نتاشہ سے بہت اٹیچڈ ہو گئی تھی۔ وہ کیسے اسے بہلائیں گے۔ نتاشہ کا تو خیر اب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مسز انصاری آچکی تھیں۔ وہ ان کے گھر رہ کر کہیں بھی جاب کر سکتی تھی...... لیکن کرن......

ان کی نظریں کرن کے کمرے کی طرف اٹھیں۔ کرن کی قل، قل کرتی ہنسی کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ اور اسی ہنسی میں کبھی، کبھی ایک مترنم سی ہنسی بھی شامل ہو جاتی۔ اور کرن کبھی اس طرح خوش نہیں ہوئی تھی جیسے آج کل تھی۔ کبھی انہوں نے اسے اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ تو کیا وہ ڈاکٹر داؤد کی بات مان لیں...... ابھی چند دن پہلے ہی تو وہ کہہ رہے تھے۔

''یار تمہیں شادی تو کرنی ہی ہے تو پھر نتاشہ سے ہی کر لو...... کرن کو اس سے اچھی ماں نہیں مل سکتی...... پتا نہیں تمہاری کزن ملے گی بھی یا نہیں...... تو سیکنڈ آپشن اسے ہی رکھ لو......'' سمیرا بھابی نے بھی ایک روز اسی طرح کی بات کی تھی۔

''اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے...... اسے گھر مل جائے گا اور تمہیں کرن کے لیے ماں مل جائے گی، میرا دل کہتا ہے کہ وہ اچھی ماں ثابت ہوگی......'' انہوں نے دونوں کے ان مفت کے مشوروں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کیا کہتے کہ خود ان کا دل بھی باغی ہو رہا ہے۔

یہ دل بھی عجیب شے ہے...... ذہن کا حکم مانتا ہے نہ عقل کی بات...... اس کے موسم صرف اسی کے لیے ہیں...... انہوں نے خود کو وقت کے حوالے کر دیا تھا۔ بابا کی وہ چھوٹی سی خواہش بھی اونچے پہاڑ کے مانند لگنے لگی تھی جسے پورا کرنا انہیں ناممکن لگ رہا تھا۔ اور یہ نتاشہ...... یہ اجنبی لڑکی جس کے متعلق اب بھی وہ کبھی، کبھی مشکوک ہو جاتے تھے ان کے ارادوں اور مجبوریوں کی دیوار پھلانگتی جا رہی تھی۔ ''یہ کیسی رائگاں خواہش میرے دل میں پیدا ہو رہی ہے......'' انہوں نے سوچتے ہوئے دروازے سے نظریں ہٹا کر پھر اخبار پر مرکوز کر دیں۔ کتنی دیر سے وہ اخبار لیے بیٹھے تھے اور ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا تب ہی دروازہ کھلا اور کرن ہنستی ہوئی کھلکھلاتی سی باہر آئی۔ اس کے پیچھے وہ تھی لبوں پر مسکراہٹ لیے...... جیسے چاندنی چٹکی ہو۔

''بابا......!'' کرن دوڑتی ہوئی ان کے پاس آکھڑی ہوئی۔

''جی بابا کی جان کیا ہو رہا تھا؟''

''کچھ نہیں...... ہم بس مزے، مزے کی باتیں کر رہے تھے۔ ہنسنے والی...... اور بابا......'' وہ سنجیدہ ہوئی۔

''ہمیں شام کو انکل داؤد کے گھر جانا ہے ناں سفی کی برتھ ڈے پارٹی میں تو میں نتاشہ آنٹی سے کہہ رہی تھی کہ یہ بھی چلیں لیکن نہیں چلتیں۔ بابا آپ ان سے کہیں ناں...... یہ بھی چلیں ہمارے ساتھ۔ سمیرا آنٹی

کل آئی تھیں تو انہوں نے ان سے بھی کہا تھا کہ آپ نے بھی آنا ہے اور یہ......'' اس نے منہ بسورا۔

''ان کا جی نہیں چاہ رہا ہوگا بیٹا...... اس لیے منع کر رہی ہوں گی......'' انہوں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔

''نہیں بابا...... ان کے پاس پارٹی میں جانے کے لیے اچھا ڈریس نہیں ہے ناں، مجھے پتا ہے یہ اس لیے نہیں جا رہیں...... ورنہ ان کو تو میرے ساتھ ہر جگہ جانا اچھا لگتا ہے۔'' کرن اپنی عمر کے بچوں سے زیادہ ذہین تھی...... اکثر وہ کوئی نہ کوئی بات کر کے سب کو حیران کر دیتی تھی۔

''نہیں...... نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں ہے...... وہ میں...... مجھے مناسب نہیں لگتا ایک فیملی گیدرنگ میں جانا...... میں کرن کی ٹیوٹر ہوں......''

''سمیرا بھابی نے آپ کو انوائٹ کیا ہے...... چاہے کرن کی ٹیوٹر کی حیثیت سے کیا ہے، چاہے اپنی دوست سمجھ کر آپ کو جانا تو چاہیے۔''

انہوں نے اس کی بات کاٹی تھی...... اس کی پلکیں اور رخسار جیسے گھبراہٹ کی شفق میں جھلملانے لگے تھے اور انہیں لگا تھا یہ لرزتی پلکیں...... شفق رنگ رخساروں پر ان لرزتی پلکوں کے سائے ہمیشہ کے لیے ان کی آنکھوں کے زنداں میں مقید ہو گئے ہیں۔ ایک کشش تھی جو انہیں اس کی طرف دھکیلتی تھی...... اور اس کشش کے خوف سے وہ اس کی طرف دیکھتے ہی نہیں تھے۔ اپنے دل کی نفی کرنا آسان نہیں ہوتا اور وہ اپنے دل کی نفی کر رہے تھے بہت دنوں سے۔ انہوں نے فوراً ہی اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں کہ انہیں اس کا جادو خوفزدہ کرتا تھا۔ انہیں اپنے عہد کا پاس تھا جو آخری سانسیں لیتے اپنے بابا سے انہوں نے کیا تھا۔ وہ یک دم اخبار رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

''آپ کرن کو تیار کریں اور خود بھی تیار ہو کر فوراً باہر پورچ میں آجائیں۔''

''جی میں......؟'' اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں آپ...... مجھے کرن کو برتھ ڈے پارٹی کے لیے شاپنگ کروانی ہے تو ظاہر ہے آپ ساتھ ہی چلیں گی...... آپ کو کرن کے لیے ہی رکھا گیا ہے ناں......؟'' انہوں نے آخری جملے کا اضافہ جان بوجھ کر کیا تھا کہ کہیں وہ جانے سے انکار نہ کر دے...... اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور اس نے کرن کا ہاتھ پکڑا تھا۔

''چلیں، میں آپ کو تیار کروادوں......'' اور جب وہ تیار ہو کر آئے تو وہ کرن کی انگلی پکڑے چادر اوڑھے پورچ میں کھڑی تھی ...... کچھ سنجیدہ سی...... آنکھوں کی وہ بے تحاشا چمک ماندسی تھی۔

''میں نتاشہ آنٹی کے ساتھ بیٹھوں گی......'' کرن پچھلی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

کرن کے لیے شاپنگ کرنے اور گفٹ خریدنے کے بعد وہ لیڈیز سوٹ والے پورشن میں آئے اور انہوں نے ایک سوٹ باہر نکالا۔

''یہ سوٹ کیسا ہے......؟ اگر پسند ہے تو ٹرائی کرلیں اور کچھ اور بھی دیکھ لیں......'' انہیں احساس ہوا تھا کہ اس کے پاس گنے چنے وہی دو تین جوڑے ہیں جو سمیرا بھابی نے لا کر دیے تھے اور یہ چادر جو اس نے اوڑھی ہوئی تھی وہی تھی جو نہر میں چھلانگ لگاتے ہوئے اس نے لی ہوئی تھی۔

''لیکن میں......''

''پلیز مس نتاشہ لے لیں ایک پارٹی ڈریس اور دو تین مزید...... معذرت کہ مجھے خود پہلے اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ آپ نے ہمارے ساتھ پارٹی میں جانا ہے۔''

''جی وہ میرے پاس پیسے ہیں تنخواہ کے، لے لوں گی......''

''بتانے کا شکریہ......'' انہوں نے ہینگر آگے پیچھے کرتے ایک اور ڈریس نکالا۔

''جائیں ان کو ٹرائی کریں...... میں اور کرن دیکھتے ہیں اور کچھ......''

''نہیں پلیز نہیں بس یہ دونوں کافی ہیں۔'' اس نے ہینگر پکڑ لیا تھا۔

''اوکے......ابھی یہ لے لیں پھر کسی روز آجائیں گے۔'' بے حد حیران سا ہو کر اس نے ہینگر پکڑ لیے تھے۔ وہ سفیان کے لیے اپنی طرف سے گفٹ لینا چاہتی تھی لیکن تیمور علی نے منع کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ ''میں نے ہم سب کی طرف سے گفٹ لے لیے ہیں۔'' کبھی، کبھی انسان کے لبوں سے کچھ لفظ جملے یوں ہی نکل جاتے ہیں بے ارادہ خود اسے ادراک نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن سننے والے کے دل پر یہ جملے کسی الہام کی طرح اترتے ہیں۔ نتاشہ بھی لفظ ''ہم'' میں الجھ گئی تھی کوئی نامعلوم سی آگہی، کبھی اس کے چہرے پر رنگ اور چمک بن کر اترتی اور کبھی سہم جاتی......وہ تو خود سے خود کو چھپاتی پھر رہی تھی۔ پتا نہیں کب یہ شخص اپنی تمام تر نرمیوں اور کھرے پن کے ساتھ اس کے دل میں اتر آیا تھا لیکن وہ خود سے بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

''ہم سب کی طرف سے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ کبھی ہم تینوں ایک فیملی ہوں......میں، کرن اور تیمور......'' اور پھر وہ خود ہی اپنی اس خواہش پر خوفزدہ ہو گئی، ڈر گئی......لیکن گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی کرن کی چھوٹی، چھوٹی باتوں کا جواب دیتے ہوئے وہ بار، بار خواب دیکھنے لگتی......''زندگی میں اب تھا ہی کون...... بابا، اماں دونوں ہی چلے گئے اور وہ ایک شخص جس کو بابا اس کا ہاتھ تھمانا چاہتے تھے وہ پتا نہیں دنیا کے کس کونے میں تھا۔ سترہ سال کی عمر سے ہی وہ اس خیال کے ساتھ جی رہی تھی کہ کسی روز وہ اس کی کھوج میں اسے ڈھونڈتا ہوا آجائے گا لیکن وہ نہیں آیا تھا اور ماموں نے اپنے احسانوں کا بدلہ مانگ لیا تھا۔ اماں کو پتا نہیں یقین تھا یا نہیں لیکن اسے تو تھا کہ وہ ایک روز آجائے گا کہ بابا کو یقین تھا اور وہ کتنے خوش تھے۔ اپنوں کو پا کر اور وہ اسفند علی جس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بہن ہونے کا مان دیا تھا اس نے بھی اپنے کہے کی لاج نہیں رکھی۔ اسے اگر ان کا خیال ہوتا تو صوفی صاحب سے ان کا پتا لے کر آجاتا وہاں صوفی صاحب تو صبح سات بجے ہی اپنی دکان کھول کر بیٹھ جاتے تھے اور ان کے گھر جانے والا ہر شخص ان کی نظر میں ہوتا تھا۔ کاش امان اللہ ہی گم نہ ہوتا تو اس کا سہارا ہوتا......اماں نے اسے بتایا تھا کہ بابا نے اس کا نام اپنے بہت پیارے دوست کے نام پر امان اللہ رکھا تھا جو امان کی پیدائش کے چند ماہ پہلے ایک حادثے میں مر گیا تھا۔ بابا اسے امن کہہ کر بلاتے تھے اور اماں مان کہہ کر......بابا کا امن اور اماں کا مان......پتا نہیں کہاں ہوگا اب......زندہ بھی ہوگا یا نہیں......یا شاید کہیں کسی گلی، کسی سڑک کنارے بھیک مانگ رہا ہوگا......'' اس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔

تیمور علی نے بیک ویو مرر میں اسے دیکھا مڑ کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گئے......کرن کھڑکی کے شیشے سے ناک لگائے باہر دیکھ رہی تھی۔

''جب سے یہاں آئی ہے پہلی بار باہر نکلی ہے۔ شاید کسی یاد نے آنکھوں کے فرش گیلے کر دیے......شاید کبھی وہ اپنے والدین کے ساتھ یا کسی اپنے کے ساتھ یہاں شاپنگ کرنے آئی ہو......'' یہ خیال آتے ہی وہ بے اختیار پوچھ بیٹھے۔

''کیا آپ کبھی یہاں گوجرانوالہ آئی ہیں......؟''

''نہیں......'' اس نے چونک کر کہا۔

''بابا کبھی کبھار ذکر کرتے تھے گوجرانوالہ کا شاید ان کے کوئی جاننے والے یہاں رہتے ہوں......میں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کراچی، کچھ لاہور کچھ مظفر آباد اور کچھ... میرپور میں گزارہ......اور کچھ اسلام آباد پڑھائی کے لیے۔'' وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ لاہور میں وہ کہاں رہتی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ اسے ان کا اس طرح، اس کی ذاتی زندگی کے متعلق سوال کرنا شاید برا لگے۔ گھر تک خاموشی ہی رہی۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا تو......پورچ میں چھوٹی پھپھو کی گاڑی دیکھ کر وہ چونکے۔

''کون آیا ہے کریم؟'' انہوں نے کریم سے پوچھا جو پھپھو کی گاڑی پر کپڑا مار رہا تھا۔

''سین بی بی آئی ہیں......''

''سین......'' انہوں نے زیرِ لب کہا۔

digest novels lovers group

”لیکن وہ لوگ تو لاہور جا رہے تھے۔“ اور یہ ہی بات انہوں نے اندر لاؤنج میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی سبین سے بھی پوچھ لی۔

”بس موڈ نہیں بنا سب چلے گئے تھے۔ امی، خالہ کی طرف چلی گئیں۔ میں گھر میں اکیلی بور ہو رہی تھی سوچا کچھ وقت اپنے کزن کے ساتھ گزار لوں......“ اس کی نظریں کرن کے بجائے ثناشہ پر تھیں جو شاپنگ بیگ اٹھائے وہاں ہی داخلی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ کرن بھاگ کر اس کی طرف آئی تھی۔

”سبین آنٹی...... میں آپ کو یاد کرتی تھی۔“

”اچھا......“

سبین کے انداز میں وہ گرم جوشی نہیں تھی جس گرم جوشی سے کرن اس کی طرف بڑھی تھی۔ اس نے بس دو انگلیوں سے اس کا رخسار چھوا تھا۔ کرن حساس بچی تھی اس نے اس سرد مہری کو محسوس کر لیا تھا اور سمجھا کہ شاید سبین کو اس کی بات کا یقین نہیں آ رہا کہ وہ اسے یاد کرتی تھی۔

”بے شک آپ ثناشہ آنٹی سے پوچھ لیں...... میں تو روز یاد کرتی تھی آپ کو اور میں نے ثناشہ آنٹی کو آپ کی بہت ساری باتیں بتائی تھیں۔“ اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور مڑ کر ثناشہ کی طرف دیکھا۔

”ہیں ناں ثناشہ آنٹی......“ ثناشہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ سبین نے اس کا ہاتھ بازو سے الگ کیا۔ تیمور علی نے محسوس کیا کہ اس ہاتھ کو ہٹانے میں نرمی نہیں سختی تھی۔

”کرن بیٹا، آپ اپنا سامان روم میں رکھیں جا کر پھر آ کر اپنی سبین آنٹی سے باتیں کیجیے گا۔“

کرن نے ثناشہ کے پاس جا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے کی طرف جاتے ہوئے سبین کے پاس رکی۔

”یہ ثناشہ آنٹی ہیں اور یہ سبین آنٹی......“

”السلام علیکم......!“

ثناشہ نے سلام کیا لیکن سبین نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بھی ثناشہ نے سلام کیا تھا جسے اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

تیمور علی نے بھی ثناشہ کی طرح سمجھا تھا کہ اس نے سنا نہیں لیکن اس نے جان بوجھ کر جواب نہیں دیا تھا اس کا اندازہ اب ہوا تھا انہیں......

”کرن کی شاپنگ سنبھال کر آپ کچھ دیر کے لیے ریسٹ کرنے کے لیے جا سکتی ہیں......“ انہوں نے ثناشہ کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا تھا۔ سبین کے سلام کا جواب نہ دینے کی وجہ سے شاید اسے توہین کا احساس ہوا ہو گا۔

”تو شاپنگ کروائی جا رہی تھی۔“ اس کی آنکھوں میں ہی نہیں آواز میں بھی شعلوں کی سی لپک تھی۔

”ہاں......“ بہت اطمینان سے کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

”تمہیں بتایا تو تھا کہ شام کو جانا ہے ڈاکٹر داؤد کی طرف ان کے بیٹے کی سالگرہ میں، تو کرن کے لیے ڈریس لینا تھا اور گفٹ بھی......“

”ہوں...... تو کیا ان محترمہ کے لیے بھی ڈریس خریدنا تھا کیا اسے بھی پارٹی میں جانا ہے؟“ عجیب سا لہجہ تھا آگ برساتا ہوا۔

”ہاں......“ انہوں نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

”سمیرا بھابی نے بہت اصرار سے بلایا ہے اسے اور پھر کرن بھی اس کے بغیر جانے کو تیار نہیں تھی تو یہ میری ذمے داری ہے کہ پارٹی میں جانے کے لیے کوئی مناسب سا ڈریس ہو اس کے پاس جبکہ اس کے اپنے پاس خاصے پرانے کپڑے ہیں۔“

”تو کیا رفیق، کریم، خان چاچا سب کو انوائٹ کیا ہے آپ کے داؤد بھائی نے......؟“

”نہیں، صرف اسے کہ وہ کرن کی ٹیوٹر ہے اور کرن اس سے بہت مانوس ہے اور پھر سمیرا بھابی بھی اسے اپنی چھوٹی بہن کہتی ہیں۔“ ان کا اطمینان ویسا ہی تھا تاؤ دلاتا ہوا سا اور وہ تاؤ کھا گئی تھی۔ چند لمحے وہ قہر آلود نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ اور پھر جیسے وہ پھٹ سی پڑی تھی۔

”اور آپ نے کیا رشتہ بنا رکھا ہے...... بہت

حسین ہے..... اتفاق سے جتنی بار بھی آئی ملاقات نہیں ہوئی ورنہ پہلے ہی اندازہ ہو جاتا، یہ تو اب سمجھ میں آئی ہے کہ خالہ کے گھر کے اب چکر کیوں نہیں لگتے...... چھٹی کا دن اچھا گزر جاتا ہوگا اس کی رفاقت میں.....''

ضبط کی کوشش میں ان کا رنگ سرخ ہو رہا تھا اور مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔

''تم حد سے گزر رہی ہو سین.....''

''ا..... چھا.....'' اس نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''حد سے تو آپ گزر چکے ہیں تیمور علی صاحب...... اندازہ ہو رہا ہے، نانا جان کو تو احساس بھی نہیں ہوگا کہ کرن کے لیے اس لڑکی کو ہائر کر کے کتنی بڑی غلطی کر بیٹھے ہیں۔ آپ کو اگر پتا نہ ہو تو میں بتا دوں کہ نانا جان نے شاہ میر ماموں کو خاندان سے باہر شادی کرنے پر گھر سے نکال دیا تھا۔''

''بہت شکریہ اس اطلاع کا سین بی بی..... میں اپنے گھر میں کیسے رہتا ہوں، کیا کرتا ہوں اس کے لیے کسی کو جوابدہ نہیں ہوں..... اور بس اب مزید کوئی بات نہیں..... میں اپنے کردار پر اٹھنے والی انگلی کو کاٹ دینے کا قائل ہوں.....'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ مزید یہاں رکتے تو کہیں کچھ غلط منہ سے نکل جاتا تو سین نے گھر جا کر واویلا مچا دینا تھا۔

''مہراں.....'' انہوں نے ٹرالی لے کر آتی مہراں کی طرف دیکھا۔

''سرو کرو انہیں..... میں کچھ دیر ریسٹ کروں گا، شام کو پارٹی میں بھی جانا ہے اور مس نتاشہ سے کہہ دینا ٹھیک سات بجے وہ کرن کو بھی تیار کر دیں اور خود بھی تیار ہو جائیں۔ ساڑھے سات بجے تک ہم گھر سے نکل جائیں گے۔ اوکے سین تم چائے اور کبابوں وغیرہ کے ساتھ انجوائے کرو..... تمہیں رفیق بھائی کے بنے ہوئے یہ کباب بہت پسند ہیں ناں.....''

''تھینک یو.....'' وہ تلملا کر کھڑی ہو گئی۔

''اس چائے کو آپ اکیلے یا اپنی اس نتاشہ بی بی کے ساتھ انجوائے کریں..... میں جا رہی ہوں.....''

''اچھا مشورہ ہے..... اب یہ اتنے سارے کباب، کیک وغیرہ میں اکیلے تو نہیں کھا سکتا تھا ناں.....'' وہ بھی اسے چڑانے پر تلے ہوئے تھے۔ اور وہ ایک غصیلی نگاہ ان پر ڈالتی ٹک ٹک کرتی لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی تو وہ واپس صوفے پر بیٹھ گئے۔

''مہراں میرے لیے چائے بنا دیں..... اور باہر کریم وغیرہ کو چائے بھجواتا تو ساتھ میں یہ سب کباب وغیرہ بھی بھجوا دینا۔'' انہوں نے ٹرالی کی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گھونٹ، گھونٹ چائے پیتے وہ سین کے رویے پر غور کرنے لگے تھے۔ سین سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ لیکن دادا جان اور بڑی پھپو وغیرہ کے اصرار پر وہ تذبذب میں پڑ جاتے تھے کہ سب کا یہ کہنا تھا جو غیر لڑکی تمہاری زندگی میں آئی۔ کیا خبر کرن کے ساتھ کیا سلوک کرے سین تو پھر اپنی ہے۔ اپنا مارے گا تو چھاؤں میں ڈالے گا..... گھسا پٹا محاورہ..... لیکن آج جس طرح سین نے کرن کو اگنور کیا تھا۔ اس نے اس فیصلے پر مہر لگا دی تھی۔ نتاشہ کے حوالے سے سین نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ ان کے لیے مارجن دینے کو تیار تھے کہ یہ انسانی فطرت ہے لیکن کرن کے ساتھ اس کے روکھے سے رویے نے انہیں تکلیف دی تھی۔ وہ چائے پی کر مطمئن سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے کرن کے کمرے میں جھانکا تھا۔ وہ مزے سے اپنے ٹیڈی بیر کے گرد بازو لپیٹے سو رہی تھی۔ آج وہ بہت سویرے جاگ گئی تھی تو یقیناً تھک گئی ہوگی..... یہ تو سین تھی، انہوں نے تو بابا سے بھی کہہ دیا تھا کہ ''اگر... شاہ میر تایا کی بیٹی نے خوش دلی سے کرن کو قبول نہ کیا تو وہ ان سے کیا ہوا عہد نہیں نبھا پائیں گے لیکن بابا بہت پریقین تھے۔ ''شاہ میر محبتوں سے گندھا ہوا تھا۔ غیروں کے لیے بھی اس کا دل بے حد کشادہ اور وسیع تھا تو اس کی بیٹی بھی ایسی ہی ہوگی.....'' اور وہ شاید بھی

جان ہی نہیں سکیں گے کہ وہ کیسی تھی...... ''سات سال سے زیادہ ہو گئے ..... شاہ میر تایا کو دنیا سے گئے ہوئے اور اب تک تو شاید صبا آنٹی نے اس کی شادی بھی کردی ہو...... لیکن کاش ایک بار وہ مل جائیں تو میں بابا سے کیے ہوئے عہد سے آزاد ہو جاؤں......'' انہوں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے تکیے کے پاس پڑی اسلامی تاریخ کی وہ کتاب اٹھالی جس کا مطالعہ پچھلے دو دنوں سے کر رہے تھے۔ تاریخ سے انہیں بے حد دلچسپی تھی اکثر تاریخ کی کتابیں فارغ وقت میں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں وہ کتاب میں کھوئے ہوئے تھے جب مہراں نے آکر کھانے کا پوچھا۔

''کرن کو جگایا؟'' انہوں نے فوراً پوچھا۔

''جی وہ تو خود ہی جاگ گئی تھی اور اس کے لیے فرنچ فرائز بنانے تھے رفیق بھائی نے اور اب وہ کھانا نہیں کھائے گی۔'' مہراں نے ان کے ان کیے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر میرے لیے یہاں ہی کھانا لے آؤ......'' پھر وہ شام تک کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ اس دوران کرن دو بار ان کے پاس آئی تھی......اور دو تین باتیں کر کے چلی گئی تھی۔ اس نے سبین کے لیے بھی ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

''انہوں نے مجھ سے بات ہی نہیں کی پیار بھی نہیں کیا۔ میری ان سے کُٹی ہے...... ناراض ہوں میں ان سے۔''

''وہ جلدی چلی گئی تھیں ناں...... اس لیے آپ سے باتیں نہیں کر سکیں۔'' انہوں نے کرن کو سمجھایا تو اپنی عادت کے مطابق جی بابا کہہ کر وہ چلی گئی تھی۔ کرن تو سمجھ گئی تھی لیکن سبین کو کون سمجھا سکتا تھا جس نے اچھا خاصا ایشو بنا دیا تھا، جس کا پتا انہیں دوسرے دن چلا تھا۔

جب وہ آفس سے آئے تو چھوٹی پھپو، بڑی پھپو کے ساتھ سبین بھی موجود تھی۔ حالانکہ بڑی پھپو اپنے جوڑوں کے درد کی وجہ سے کم ہی گھر سے باہر نکلتی تھیں۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ سبین نے ہی کوئی الٹی سیدھی باتیں کی ہوں گی تاہم وہ بہت خوش دلی سے سب سے ملے تھے۔

مہراں سے کرن کا پتا کیا عموماً جب وہ آفس سے آتے تو وہ سو رہی ہوتی تھی۔ اسکول سے آکر کھانا وغیرہ کھا کر کچھ دیر وہ اپنے کھلونوں سے کھیلتی۔ ثناشہ سے باتیں کرتی، تھوڑا بہت ہوم ورک کر کے سو جاتی تھی۔ جب وہ آفس سے آجاتے تو شام کی چائے سے پہلے مہراں اسے جگا دیتی تھی تو کچھ وقت ان کے ساتھ گزارتی پھر ثناشہ آجاتی اور پھر رات کے کھانے تک ثناشہ اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ اسے قاعدہ پڑھانا، اسکول کا ہوم ورک کروانا......اور دین کے متعلق چھوٹی، چھوٹی باتیں بتانا یہ سارے کام اسی دوران ہوتے تھے۔ اور وہ اس روٹین سے بہت مطمئن تھے۔

انہوں نے مہراں کو کھانے کا منع کر دیا تھا۔ چائے بڑے خوشگوار ماحول میں پی گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کرن بھی جاگ کر آ گئی تھی اور تب سے نانو کی گود میں بیٹھی تھی اور بار، بار اپنے ننھے، ننھے ہاتھوں سے ان کا چہرہ اپنی طرف موڑ کر بات کرنے لگتی تھی۔ باتیں جو ثناشہ کے متعلق تھیں اور بڑی پھپو کو اپنی بات کرنے کا موقع مل گیا۔

''کیسی لڑکی ہے وہ، کرن کا صحیح خیال رکھ رہی ہے وہ؟''

''جی......!'' ان کا جواب مختصر تھا۔

''کہاں ہے وہ ہم سے تو ملواؤ مردوں کو بھلا کیا پتا یہ اس طرح گھروں میں گھس کر بیٹھ جانے والی لڑکیاں کتنی چلتر ہوتی ہیں۔''

''آنے والی ہوگی مل لیجیے گا۔'' ان کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمکی تھی گویا آہستہ آہستہ وہ اصل موضوع کی طرف آ رہی تھیں۔

''کہاں ہوتی ہے پورے گھر میں تو کہیں نظر نہیں آئی۔'' وہ جانتے بوجھتے پوچھ رہی تھیں۔

''مہراں نے نہیں بتایا اینکسی میں رہتی ہے۔''

انہوں نے ایک نظر سبین پر ڈالی جو بظاہر بے نیازی گود میں رکھے میگزین کے صفحات الٹ رہی تھی۔ تب ہی

digest novels lovers group

داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ مہراں نے دروازہ کھولا اور پھر وہ وہاں ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ کرن نانو کی گود سے اتر کر اس کی طرف بھاگی۔

''ثناشہ آنٹی میری نانو۔''

اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور قریب آ کر سب کو سلام کیا۔ بڑی پھپو اور چھوٹی پھپو اسے تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جبکہ سیبن قہر آلود نظروں سے۔ مدھم سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

''ٹھیک ہے ثناشہ آپ جائیں۔ آج کرن کی چھٹی ہے اس کی نانو آئی ہوئی ہیں تو یہ ابھی ان کے ساتھ ہے۔ رات کو ہوم ورک وغیرہ کروا دیجیے گا۔''

''جی......!'' وہ واپسی کے لیے مڑی۔

''اے لڑکی سنو۔'' چھوٹی پھپو کا انداز کچھ تحقیر آمیز سا تھا۔

''کہاں سے آئی ہو...... ماں، باپ کہاں ہیں، کتنے بہن، بھائی ہو، باپ اور بھائی اگر ہیں تو کیا کرتے ہیں؟''

''آزاد کشمیر سے...... والدین اور بہن بھائی نہیں ہیں۔''

''وہ کرن کا ٹھیک سے دھیان رکھتی ہو، تیمور کی عدم موجودگی میں مارتی پیٹتی تو نہیں ہو ہماری بچی کو؟'' تفتیشی انداز اور کھوجتی نظریں۔ لمحہ بھر کے لیے وہ گھبرائی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود اعتمادی سے کہا۔

''یہ سوال تو آپ کو کرن سے پوچھنا چاہیے میم۔'' اس کی فطری خود اعتمادی ان تین چار ماہ میں لوٹ آئی تھی۔

''آپ جائیں مس ثناشہ اور پھپو آپ مزید کچھ جاننا چاہتی ہیں تو میں بتا دیتا ہوں۔'' انہوں نے پھپو کی طرف رخ کیا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔'' وہ ذرا سا جھینپ گئیں۔

''وہ بس یوں ہی اپنی تسلی کر رہی تھی آج کل اجنبی لوگوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔''

''اعتبار تو اپنوں پر بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بعض اوقات وہ بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔''

تحریر کا رشتہ

ہم لوگوں کا تحریر کا رشتہ کتنا گہرا اور مضبوط ہے، رخ کے انتقال کی خبر سنی تو ایک مخلص و مسکراتا چہرہ ذہن میں آیا۔ پاکیزہ سے رخ کی دیرینہ وابستگی تھی اور میں رخ کو پاکیزہ کے توسط سے ہی کافی عرصے سے جانتی تھی۔ جانے والے کی اچھی یادیں ساتھ رہ جاتی ہیں اس سے پہلے سیما یاسمین مجتبیٰ بھی ابدی سفر پر روانہ ہوئیں اس نے بھی پاکیزہ میں سب سے زیادہ لکھا۔ میری دعا ہے کہ رخ و سیما اور تمام مرحومین رائٹرز اور پاکیزہ بہنیں جو اب ہم میں نہیں کی ارواح کو سکون ہو اور مستقل ٹھکانا جنت ہو اور ان کے لیے آخرت کی تمام منازل آسان ہوں۔ آمین۔

از: فہمیدہ جاوید، ملتان

''ہاں یہ تو ہے۔'' بڑی پھپو نے تائید کی اور سیبن کی طرف دیکھا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں ذرا باہر لان تک جا رہی ہوں۔ اندر کچھ حبس سا محسوس ہو رہا ہے۔''

''آج کل ہمیں تو اے سی کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی اس لیے مجھے خیال نہیں رہا، آن کر دیتا ہوں۔'' وہ اٹھے۔

''نہیں بیٹا، ضرورت نہیں ہے بیٹھو آرام سے۔''

بڑی پھپو نے سیبن کے باہر جانے کا انتظار کیا اور پھر ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ان کا دھیان کرن کی طرف تھا جو چپ سی کھڑی تھی۔ انہوں نے نوٹ کیا تھا کہ سیبن نے کرن کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی بس وہی دو انگلیوں سے اس کا رخسار چھوا تھا۔ یہ کیسی محبت ہے انہوں نے خود سے پوچھا تب ہی بڑی پھپو نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

''تو کیا سوچا ہے تم نے اب کیا ساری زندگی

یوں ہی گزار دو گے۔" ان کا جواب سنے بغیر انہوں نے کرن کی طرف دیکھا۔

"بیٹا آپ بھی جاؤ لان میں اپنی سبین آنٹی کے ساتھ کھیلا کودو۔"

"نہیں، میری ان سے کُٹی ہے۔"

"بری بات ہے ایسا نہیں کہتے، چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں اور اپنی بیٹی کی صلح کروا دیتے ہیں۔" چھوٹی پھپھو کو بھی وہاں سے جانے کا بہانہ مل گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ خوشی، خوشی ان کے ساتھ باہر چلی گئی۔

"ہاں تو میاں اب بتاؤ کیا پروگرام ہے تمہارا؟" بڑی پھپھو پھر پوچھ رہی تھیں۔

"بس دو تین ماہ بعد واپس جا رہا ہوں۔" وہ سمجھ گئے تھے کہ سبین کیوں باہر گئی اور گفتگو اب کون سا رخ اختیار کرنے والی تھی۔

"تو سبین کے متعلق کیا سوچا ہے تم نے؟"

"سبین کے متعلق میں نے کیا سوچنا ہے۔ یہ کام اس کے دا... ن کا ہے۔" مدھم سی مسکراہٹ لبوں کی تراش میں نمودار ہوئی۔

"ادھر ادھر کی مت ہانکو تیمور میں نے تم سے سبین کے متعلق بات کی تھی۔"

"تو میں نے تب ہی بتا دیا تھا آپ کو کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ سبین میرے لیے سوٹ ایبل نہیں ہے شاید میں کرن کی خاطر سوچتا کچھ۔ دوسرا آپشن تھی وہ میرے لیے لیکن وہ کرن کے ساتھ مخلص نہیں ہے، اسے کرن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ جو محبت کرن کے لیے شو کرتی ہے وہ سب دکھاوا تھا۔" وہ صاف اور کھری بات کرنے کے عادی تھے، اپنے ماحول سے انہوں نے یہی سیکھا تھا۔ بڑی پھپھو لمحہ بھر کے لیے ان کی اتنی صاف گوئی پر ششدر رہ گئی تھیں۔

"اور پہلا آپشن..... کیا یہ ہے تماشہ؟"

"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ بھی فی الحال دوسرا آپشن ہے۔" انہوں نے سوچا جب دادا جان کی حد تک حقیقت جان گئے ہیں تو پھر بڑی پھپھو سے کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ شاہ میر تایا ان کے بھائی تھے اور انہوں نے دونوں پھپھیوں کو انہیں یاد کرتے اور ان کی جدائی میں روتے دیکھا تھا۔

"اور پہلا آپشن؟" بڑی پھپھو کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

"پہلا آپشن وہ جس کے لیے میں دو سال سے یہاں بیٹھا ہوں شاہ میر تایا کی بیٹی۔"

"شاہ میر بھائی کی بیٹی؟" انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔" یک دم ہی ان کے لہجے میں تھکن سی اتر آئی۔

"بابا نے میرا رشتہ اس سے طے کر دیا تھا اور وہ مجھے ساتھ لے کر نکاح کے لیے آنا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے شاہ میر تایا کا انتقال ہو گیا۔" انہوں نے مختصراً بتایا تو پھپھو کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہیں شاہ میر کی موت کے متعلق تو تنویر نے بتایا تھا لیکن مزید تفصیل نہیں بتائی تھی کہ وہ کہاں، کب اور کیسے ملے تھے انہیں۔ دونوں بہنیں کتنے دن روتی رہی تھیں۔ وہ حویلی گئی تھیں جہاں ختم وغیرہ دلوائے گئے۔ دیگیں پکوا کر غریبوں میں تقسیم کروائی گئی تھیں۔ شاہ میر نے بچپن میں ان کے بہت لاڈ اٹھائے تھے۔

"کیا تھا ابا جان انہیں پسند کی شادی کرنے دیتے یا پھر شاہ میر بھائی ہی ان سے معافی مانگ لیتے۔ باپ تھے کب تک ناراض رہتے۔" انہوں نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔

تیمور خاموش رہے کہ جتنا بتا دیا تھا اتنا کافی تھا۔ جو بات دادا جان اور دادی جان نے کسی کو نہیں بتائی تھی انہوں نے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھی تھی وقت خود ہی بہت سارے بھیدوں سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔

"تو؟" ان کی سوالیہ نظریں پھر تیمور کی طرف اٹھیں۔

"تو یہ کہ دو تین ماہ تک کوئی کھوج مل گیا تو ٹھیک، نہیں تو واپس چلا جاؤں گا۔"

"اور سبین اس کے رشتے آ رہے ہیں تو کیا تمہارا

فیصلہ اٹل ہے۔ اگر ذرا سی بھی گنجائش ہو تو ہم سب کی بہت خواہش ہے سبین کے لیے۔''

''نہیں پھپھو...... اگر کوئی بہت اچھا رشتہ ہے اور سبین کو بھی اعتراض نہیں ہے تو کر دیں اس کا رشتہ...... اگر کوئی گنجائش تھی بھی تو اب نہیں ہے۔''

''سبین تو......'' وہ اتنا کہہ کر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگئی تھیں۔ اور وہ بے حد ریلیکس موڈ میں اپنے اور کزنوں کے متعلق پوچھنے لگے تھے۔ اور وہ بھی تفصیل سے بتانے لگی تھیں۔ اور پھر کچھ دیر بعد وہ چلی گئی تھیں۔ ان کے اصرار پر بھی وہ رات کے کھانے کے لیے نہیں رکی تھیں۔ اور وہ جب ڈنر کے لیے ڈائننگ روم میں آئے تھے تو کرن کا موڈ بہت خراب تھا۔

''مجھے کھانا نہیں کھانا، میں نے مہراں خالہ کو بتا دیا تھا پھر بھی وہ مجھے لے آئی ہیں۔''

''ارے میری جان کیا ہوا؟'' انہوں نے اسے گود میں اٹھا کر کرسی پر بٹھایا۔

''سبین آنٹی اور چھوٹی نانو سے میری پکی کٹی ہے۔''

''وہ کیوں......؟''

انہوں نے نتاشہ آنٹی سے لڑائی کی ہے اور کہا ہے وہ یہاں سے چلی جائیں...... اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ چلی جائیں گی وہ اتنا رو رہی تھیں بابا۔'' اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''لیکن تمہاری نتاشہ آنٹی تو انیکسی میں تھیں، کیا وہ لان میں آئی تھیں؟''

انہیں فکر ہوئی کہ اگر لان میں کوئی بات ہوئی ہے تو کریم وغیرہ نے بھی سنا ہوگا۔

''نہیں، سبین آنٹی اور چھوٹی نانو میرے ساتھ انیکسی میں گئی تھیں۔ بابا آپ نتاشہ آنٹی کو مت جانے دینا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور اگر وہ چلی گئیں تو میں بہت روؤں گی۔'' اور اس کی موٹی، موٹی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''نہیں جانے دیں گے، آپ کیوں رو رہی ہیں، شاباش رونا نہیں ہے۔'' انہوں نے بے اختیار اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی پیشانی چومی۔

''آپ انہیں راضی کرلیں گے ناں......'' اس نے یقین دہانی چاہی۔

''بالکل راضی کرلیں گے۔''

''پکا......؟'' وہ مسکرائی۔ اسے اپنے بابا کی ہر بات پر یقین ہوتا تھا۔

''ہاں پکا...... چلیں اب آپ کھانا کھائیں۔''

انہوں نے اسے تو بہلا لیا تھا لیکن خود پریشان سے ہوگئے تھے۔ اگر نتاشہ چلی گئی تو وہ کرن کو کیسے بہلائیں گے اور خود وہ...... اپنے دل کو کیسے سمجھائیں گے جو کل رات سے مچل رہا تھا۔ عجیب اودھم مچا رکھا تھا اس نے کہ لاحاصل تلاش چھوڑ کر اسے اپنا لو...... کل پارٹی میں گو تھوڑے سے ہی مہمان تھے۔ ڈاکٹر داؤد اور سمیرا بھابی کے بہت قریبی اور پھر بھی تھوڑی بہت گیدرنگ تو تھی اور کتنی ہی توصیفی نظریں نتاشہ کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ سادگی میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ بغیر میک اپ کے بھی وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ سمیرا بھابی نے بھی بے اختیار تعریف کی تھی۔ لائٹ پنک اور لائٹ فیروزی امتزاج کا بہت ساری کلیوں والا کرتا اسے بہت منفرد بنا رہا تھا۔ اگرچہ وہ سارا وقت کرن کے ساتھ ہی رہی تھی لیکن پھر بھی جب وہ ایک ساتھ آئے تھے تو پہلے سے موجود کئی مہمانوں نے انہیں میاں بیوی سمجھا تھا اور اس غلط فہمی پر اس کے چہرے پر جو رنگ بکھرے تھے اس نے تیمور علی کے دل کی نہ جانیں کتنی دھڑکنیں مس کر دی تھیں۔ اور ڈاکٹر داؤد نے ایک بار پھر انہیں مفت مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کی تلاش چھوڑ کر اسے اپنا لیں۔ لیکن پھر بابا ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے اس کا ہاتھ تھامے وعدہ لیتے۔

''وعدہ کرو تیمور صبا بھابی اور نتاشہ کو تلاش کرو گے...... ان سب تکلیفوں کی تلافی تمہیں کرنی ہے تیمور جو ابا جان نے انہیں پہنچائی ہیں۔'' لیکن وہ اس دل کا کیا کرتے جو اس کی طرف لپکتا تھا اور وہ اپنے ہی دل کی

digest novels lovers group

نفی کرتے، کرتے تھک سے گئے تھے۔

کرن کو کھانا کھلا کر اسے مہراں کے حوالے کر کے وہ انیکسی کی طرف چلے آئے تھے۔ اس کی متورم آنکھیں اور بھیگی پلکیں دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر جا کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ رات کے وقت ان کے انیکسی میں آنے پر اسے کوئی ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوا تھا کہ ان گزرے ماہ میں اتنا تو وہ جان ہی گئی تھی انہیں، اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتے تھکتی نہ تھی کہ اللہ نے اس کا واسطہ کسی برے آدمی سے نہیں ڈالا تھا۔

''مس ثناشہ......'' لفظوں کو دل ہی دل میں ترتیب دیتے ہوئے انہوں نے اس کی طرف دیکھا بھیگی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

''پھپھو جان اور سبین نے آپ سے جو کچھ بھی کہا میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ بخدا میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اس طرح کی کوئی بات وہ آپ سے کریں گی جو آپ کے لیے تکلیف دہ ہوگی۔''

''میں......'' اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

''اس طرح کی لڑکی نہیں ہوں سر کہ میں دل میں کوئی غرض چھپا کر کرن سے محبت کا ڈراما کر رہی ہوں......وہ تو اتنی پیاری ہے کہ اس پر پیار آتا ہے، خود بخود دل میں اتر آتی ہے۔ اس کا خیال رکھنا، اسے پڑھانا دیکھ بھال کرنا ضرور میری ڈیوٹی ہے۔ تنخواہ ملتی ہے مجھے اس کی لیکن جذبے تو انمول ہوتے ہیں سر......جو جذبہ اس کے دل میں میرے لیے ہے یا میرے دل میں اس کے لیے ہے اس میں کوئی منافقت نہیں ہے وہ بالکل خالص ہے۔'' آنکھوں کے فرش پھر سے گیلے ہو گئے تھے۔

''میں ایسا نہیں سوچتا مس کہ آپ نے اپنے دل کو کسی غرض سے آلودہ کیا ہوگا......ایسے الفاظ یا سوچیں آپ جیسوں کے بارے میں ترتیب نہیں پاتیں۔'' لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''لیکن انہوں نے تو ایسا ہی کہا......انہوں نے کہا میں ایک چالاک اور مکار لڑکی ہوں اور میں... نے......'' اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی تھی۔

''میں آپ سے پہلے بھی معذرت کر چکا ہوں ایک بار پھر کر لیتا ہوں......آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔''

''نہیں پلیز آپ کیوں معذرت کر رہے ہیں، آپ نے تو کچھ نہیں کہا ناں لیکن انہوں نے کہا ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں......ورنہ مجھے خود آ کر نکال دیں گی۔ پلیز ایک اور احسان مجھ پر کر دیں کہ میرا بھائی سے کہہ کر مجھے مسز انصاری کے گھر بھجوا دیں......''

''یہ میرا گھر ہے مس......سبین کا نہیں......اور کوئی آپ کو یہاں سے جانے کو نہیں کہہ سکتا......اور آئندہ آپ بھی خیال رکھیے گا......کیا کوئی بھی ایرا غیرا آپ سے جانے کو کہے تو آپ کرن کو چھوڑ کر چل دیں گی؟''

''اور میں کب کرن کو چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں......میں تو خود اس کے پاس رہنا چاہتی ہوں لیکن آپ تو خود ہی جا رہے ہیں۔''

''آپ کو کس نے بتایا؟'' وہ ذرا سا حیران ہوئے تھے۔

''پارٹی میں آپ بات کر رہے تھے ناں داؤد بھائی سے تو سنا تھا میں نے۔''

''اور اگر میں کہوں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں کرن کی خاطر...... مجھے کرن بہت عزیز ہے میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا نہ ہی اس کی اداسی مجھ سے برداشت ہوتی ہے۔''

''میں بھلا کیسے آپ کے ساتھ دوسرے ملک جا سکتی ہوں، کس رشتے سے؟''

''رشتہ بنایا بھی تو جا سکتا ہے۔'' وہ یہ کہتے، کہتے رک گئے الفاظ سنبھل گئے تھے۔

''آپ یہاں ہی اپنے وطن میں کیوں نہیں رک جاتے......پردیس جا کر کیا کریں گے......یہاں تو آپ کے اتنے اپنے عزیز رشتے دار ہیں۔ وہاں کون ہے۔'' وہ اب بڑے سکون سے بات کر رہی تھی۔

''وہاں میرے بابا، میرے بھائی، بھابی، اماں سب ہیں۔'' وہ ابھی تک کھڑے تھے۔

''تو پھر آپ یہاں کیوں آئے ہیں، کیا وہ کرن

کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے......''

''نہیں......کیونکہ وہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔''

وہ پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گئے تھے، روم میں بیڈ کے علاوہ دو کرسیاں اور ایک سینٹر ٹیبل تھی۔

بچھڑ جانے والوں کی یاد کا کرب آنکھوں میں پھیلتا چلا گیا تھا۔

''سوری، میں نے آپ کو دکھی کر دیا۔'' نتاشہ شرمندہ ہوئی۔

''یہ دکھ تو مقدر میں تھا اور جانے والے بھولتے کب ہیں۔ تو پھر طے ہو گیا کہ آپ کہیں نہیں جا رہی ہیں۔ میں نے کرن سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کو نہیں جانے دوں گا......''

وہ یک دم اٹھ کھڑے ہوئے تھے انہیں اچانک خیال آیا تھا کہ رات کے وقت یوں ان کا زیادہ دیر تک ادھر ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ تین ماہ میں پہلی بار انہوں نے اتنی رات کو دیر تک اس سے بات کی تھی۔ ابتدائی دنوں میں تو وہ اس کے متعلق تھوڑے مشکوک ہی رہتے تھے ان کا خیال تھا کہ جس نے ایک جھوٹ بولا ہے وہ اور جھوٹ بھی بول سکتی ہے اور اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تب ایک روز ان کی بات سن کر ڈاکٹر داؤد نے انہیں بتایا تھا کہ ''حادثہ ہوا تھا یہ سچ تھا۔ اس نے اس خوف سے صحیح تاریخ نہیں بتائی تھی کہ کہیں یہ جان کر کہ وہ پہلے بھی کسی شخص کی قید میں رہی ہے گھر سے ہی نہ نکال دیں ہم......'' انہوں نے تفصیل بتائی تھی۔

''مہراں کھانا لا رہی ہوگی کھا لیجیے گا......اور بھول جایئے گا جو کچھ بھی سبین اور پھپھو نے کہا ہے......لوگ بہت عجیب ہوتے ہیں مس نتاشہ نہ چاہتے ہوئے بھی بعض اوقات لوگوں کے لہجوں اور رویوں کا زہر رگوں میں انڈیلنا پڑتا ہے۔'' بات مکمل کر کے وہ رکے نہیں تھے اور مہراں کے آنے تک وہ یوں ہی ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی رہی تھی۔

یہ شخص جانے کیوں ہر گزرتے دن کے ساتھ دل و جان کی دیواریں توڑتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگی تھی۔ خواب جن کی تعبیر ممکن نہیں تھی۔ وہ، تیمور علی اور کرن لیکن اپنے ان خوابوں کو تو وہ اپنی آنکھوں سے بھی چھپاتی تھی۔

''کیا وہ یہاں سے چلی جائے......لیکن کہاں...... مسز انصاری کے ہاں سمیرا بھابی کی دوست کے ہاں؟'' لیکن وہ جہاں بھی جاتی اپنے آپ سے کہاں بھاگ سکتی تھی۔ اس نے کچھ دن پہلے لینڈ لائن پر رابعہ کو فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن فون اٹینڈ نہیں کیا گیا۔ پھر اس نے سوچا وہ اسے خط لکھے......کیا پتا اماں انہیں مل گئی ہوں۔ حادثے کے بعد انہوں نے تلاش تو کیا ہوگا اماں کو......ان کے زندہ ہونے کی امید مرتی ہی نہیں تھی......اور پھر اس نے رابعہ کو خط لکھا، اس امید پر کہ شاید اماں ہوں وہاں......یا نہ بھی ہوں تو انہیں پتا تو ہوگا کہ وہ ہیں یا نہیں......صبر آ جائے گا اسے......اور اس امید پر بھی رابعہ اس کی بات کا یقین کر لے گی اور خط ملتے ہی اس سے رابطہ کرے گی......لیکن رابعہ نے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ اسے اپنا آپ کبھی کبھی بہت حقیر سا لگتا......تنکے سے بھی زیادہ حقیر......ایسے میں یہ شخص کیوں اس کے دل میں ایک نیا اور انوکھا جذبہ جگا رہا تھا جس سے وہ ناآشنا تھی اور وہ شاید جانتا بھی نہ ہو کہ اس کی کرن کے ساتھ محبت نے ملازموں کے ساتھ اس کے رویے اور نرمیوں نے اس کے اندر کون سا جذبہ جگا دیا ہے۔ ایسا جذبہ جو زبردستی اپنی انگلیوں کی پوروں سے دل میں گدگدی مچا دے جو دھڑکنوں کو......بے ترتیب کر دے اور احساسات کو ملائمت اور نرمیاں بخش دے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ نارسائی ہے عمر بھر کی نارسائی پھر بھی وہ اس جذبے سے بچ نہیں پا رہی تھی۔ یہ جذبہ اندر ہی اندر سر اٹھاتا جا رہا تھا......اور وہ جس کے ساتھ بابا نے اس کا رشتہ طے کیا تھا وہ نہ جانے کہاں تھا......دنیا کے کس کونے میں اور پتا نہیں کبھی اس نے اسے سوچا بھی ہوگا یا نہیں......اور اس نے اس رشتے کو قبول بھی کیا ہوگا یا نہیں......اگر قبول کیا ہوتا تو اسے ڈھونڈتا تو......تلاش تو کیا ہوتا۔

آخری حصہ اگلے ماہ پڑھیں

"کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا بی بی، کھائیں تو میں برتن لے جاؤں......" اسے بھوک نہیں تھی لیکن اس نے کہا تھا تو اس کی بات کیسے نہ مانتی۔ جب سے اس نے گھر کے اندر جانا شروع کیا تھا وہ مہراں کے ساتھ کچن میں کھانا کھالیتی تھی۔ ہاں کبھی وہ کھانے کے وقت انیکسی میں ہوتی تو مہراں کھانا وہیں لے آتی۔ کرن روز ہی ضد کرتی تھی کہ وہ اُن کے ساتھ ہی کھانا کھائے لیکن وہ اسے ٹال دیتی۔ مہراں برتن لے کر چلی گئی تو وہ ایک بار پھر سوچوں میں کھو گئی۔

اور ادھر اپنے بیڈ روم میں کرن کے ریشمی بالوں میں ہولے، ہولے انگلیاں پھیرتے ہوئے تیمور علی سوچ رہے تھے کہ آج ایک اور رتجگا ان کا منتظر ہے کہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور دماغ میں بے شمار خیالات کا ہجوم تھا۔ بھی بیگن اور پھپھو کی باتوں کو سوچ کر اندر ناگواری لہریں اٹھتیں۔ جتنا بتایا گیا تھا یقیناً اس سے زیادہ کیا گیا ہوگا...... اور کبھی ایک اچھوتا سا احساس اندر سکون سا بکھیر دیتا جیسے وہ کسی نخلستان میں ٹھنڈی اور میٹھی چھاؤں میں بیٹھے ہوں...... کبھی ایک ختم نہ ہونے والی نارسائی اور ہجر کی اذیت رگوں کو کاٹنے لگتی۔ اور کبھی انتظار کی تھکن پورے وجود کو شکستہ کرنے لگتی تھی۔ انہیں لگتا تھا جیسے وہ اس تلاش اور انتظار سے تھکنے لگے ہوں اور وہ جو بابا سے کیا عہد نبھانے کے لیے آخری حد تک اسے تلاشنا چاہتے تھے، آج رات کے اس سے اپنے دل میں چھپی چور خواہش کو خود پر منکشف ہوتے دیکھ کر حیران تھے۔ انہیں تو خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ کب دل نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا

ناولٹ

تمہارے کھوج میں

نگہت سیما

پانچواں اور آخری حصہ

ڈائجسٹ ناولز لورز گروپ

کہ وہ اسے نہ تلاش سکیں اور...... اور انہوں نے اعتراف کیا خود سے کہ وہ اس سے...... نتاشہ سے محبت کرنے لگے ہیں...... لیکن شاید وہ کبھی نتاشہ سے نہ کہہ سکیں کہ وہ اس سے محبت کرنے لگے ہیں۔ اس کی رفاقت اور ساتھ کے متمنی ہیں...... صرف کرن کے لیے نہیں اپنے لیے بھی کہ انہوں نے زندگی کے ساتھی کا جو خاکہ بھی اپنے اندر بنا رکھا تھا وہ بالکل ویسی ہی تھی...... یا شاید کبھی وہ اسے بتا سکیں کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گئے ہیں...... اور پتا نہیں اس اظہار پر اس کا ردعمل کیا ہو...... ہاں شاید وہ ان کی محبت کو ان کے ساتھ کو قبول کر لے ان کے لیے نہ سہی کرن کی خاطر...... اور محبت کے اس انوکھے احساس میں گھرے جانے کب وہ سو گئے۔ صبح آنکھ کھلی تو سر اگرچہ بھاری ہو رہا تھا لیکن ایک خوشگوار سا احساس بھی وجود کے گرد لپٹا تھا...... جیسے چاروں طرف پھولوں کی خوشبو ہو اور بادلوں کی دھند ...... اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے...... شاید کوئی بہت ہی خوب صورت خواب دیکھا تھا۔ وہ کرن کو تیار کروانے آئی تو انہوں نے بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے شاید آج کی رات اُدھر بھی رتجگا تھا...... کرن اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

''آپ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی ناں...... کبھی نہیں جائیں گی......'' اس نے کرن کو پیار کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تو کرن تھینک یو کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی اور انہیں لگا ان کے اندر بھی چراغاں ہو گیا ہو...... کرن اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اسے ٹیبل تک لے آئی تھی۔

''آپ ہمارے ساتھ ناشتا کیوں نہیں کرتیں نتاشہ آنٹی......'' وہ جھجکی ہوئی سی کھڑی تھی۔

''بیٹھ جائیں مس نتاشہ...... ہم بھی آپ جیسے انسان ہیں کھا نہیں جائیں گے ہم آپ کو...... چھوٹی سی بچی کا روز دل توڑتے ہوئے آپ کو دکھ نہیں ہوتا۔''

اور وہ یوں ہی جھجکتی ہوئی سی بیٹھ گئی تھی اور پھر چھوٹے، چھوٹے لقمے بنا کر کرن کے منہ میں ڈالتے ہوئے اس کے لیے کپ میں دودھ ڈالتے اور ٹشو سے اس کا منہ صاف کرتے ہوئے دیکھ کر تیمور علی نے سوچا

''کتنا مکمل منظر ہے...... زندگی کی ہر صبح ایسے منظر سے سج جائے تو زندگی مکمل ہو جائے۔''

آج کی صبح جتنی خوشگوار تھی شام اتنی ہی سوگوار...... تنویر چاچا اچانک ہی آ گئے تھے، اداس اور دلگرفتہ سے......

''ہم نے امریکا میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اور تمہاری چچی جلدی ہی امان کے پاس چلے جائیں گے...... وہ بلا رہا ہے ہمیں...... لیکن میں نے اسے کہا ہے کہ وہ کچھ دنوں کے لیے آ جائے، کچھ امانتیں ہیں اس کے حوالے کرنی ہیں۔ کچھ زمین ہے اس کے نام کی اور جائداد...... چاہے تو فروخت کر کے پیسہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دے...... چاہے تو کسی ٹرسٹ میں دے، دے۔ ویسے اس کے پاس کمی نہیں ہے کسی چیز کی۔''

''اس کی زمین اور جائداد......؟'' وہ حیران ہوئے تھے۔

''کیا آپ اس کے حقیقی والد کو جانتے ہیں، آپ نے تو اسے کسی یتیم خانے سے نہیں لیا تھا!''

''ہاں یتیم خانے سے لیا تھا لیکن اس کے والد کو جانتا ہوں جو حیات نہیں ہیں اب......''

''اور دادا جان، آپ کے جانے کے بعد وہ حویلی میں بالکل اکیلے ہو جائیں گے......'' انہیں دادا جان کا خیال آیا تھا۔

''یہ تنہائی انہوں نے خود مول لی ہے تیمور...... شاہ میر بھائی کے ساتھ وہ اس طرح نہ کرتے تو آج ان کے بیوی بچے ہوتے ان کے ساتھ اور راز میر بھائی بھی باہر نہ جاتے...... انہوں نے کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا کہ میں نے بچہ اڈاپٹ کیا ہے...... وہ ہمیشہ دوسری شادی پر زور دیتے رہے اور امان کو واپس دے دینے کی بات کرتے رہے...... حالانکہ اسا ان کی بھتیجی ہے۔''

"کیا امان پاکستان میں نہیں رہنا چاہتا......"
تیمور علی نے پوچھا۔
"نہیں...... بلکہ میں نہیں چاہتا کہ وہ پاکستان میں رہے...... مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہاں کوئی اسے مار نہ دے۔ اور تمہاری چچی اب تنہا نہیں رہنا چاہتیں۔ وہ امان کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہیں اور امان بھی ساری زندگی ہاسٹلوں میں اور اکیلے رہتے، رہتے تھک گیا ہے۔ اس کی شادی کریں گے، اس کے بچے ہوں گے تو زندگی جینے کو جی چاہے گا۔" تنویر علی اسے بھی اتنے افسردہ اور مایوس نہیں لگے تھے۔
"کیا اس کے کوئی دشمن ہیں یہاں......"
"ہوں......" تنویر علی نے اثبات میں سر ہلایا۔
"مجھے تم سے بات کرنی تھی اور بتانا تھا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ زمین جو اماں جان کی طرف سے مجھے ملی تھی اس پر جو ہاری کام کرتے ہیں، ان میں تقسیم کردوں گا...... چچا جان کی واحد وارث اسما ہے ...... اس کا بھی اپنی زمین کے متعلق یہی ارادہ ہے کہ غریب ہاریوں میں تقسیم کردے...... اور اپنے والد کے گھر میں گاؤں کی غریب عورتوں کے لیے ایک سلائی سینٹر قائم کردیا جائے...... اس کے لیے اسما نے بات کرلی ہے۔ ماسٹر فضل دین کی بیوہ بیٹی سے۔ ابا جان کی جو زمین ہے مجھے اس میں سے وراثت نہیں چاہیے...... اب ابا جان کے وارثوں میں صرف تم، کرن اور بڑی آپا، چھوٹی آپا ہیں...... بڑی آپا اور چھوٹی آپا کو ابا جان نے پہلے ہی سرگودھا والی زمین اور گوجرانوالہ کے دو پلاٹ دے دیے تھے، ان کے حصے کے سواب صرف تم ہی وارث ہوگے۔"
"لیکن میں کیا کروں گا اتنی زمین جائداد کا......؟"
وہ گھبرا گئے تھے۔
"بابا کو تو پہلے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور مجھے بھی نہیں...... دے دیں جسے دینی ہے۔"
"کتنی عجیب بات ہے ناں تیمور وہ زمین جس کے لیے ابا جان نے اتنا ظلم کیا...... اس کا وارث بننے کو تیار ہی نہیں کوئی......" وہ ہولے سے ہنسے تھے ایسی ہنسی جس میں بے شمار آنسوؤں کی نمی تھی۔
"خیر چھوڑو...... مجھے اپنے وکیل کی طرف جانا ہے آج...... ان کے چیمبر میں...... ہاریوں کے نام زمین کیسے ہوگی؟ سارا پراسس معلوم کرنا ہے...... اپنی دستبرداری کا اسٹامپ پیپر بھی تیار کروانا ہے تم ساتھ چلو گے ناں...... اور ہاں امان یہاں ہی رہے گا گوجرانوالہ میں...... میں اسے گاؤں لے کر نہیں جانا چاہتا......"
"کیا اس کے دشمن گاؤں میں ہیں......؟"
"ہوں......"
"امان کب تک آئے گا......؟" انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔
"میں بھی اس سے نہیں ملا...... جب ہم چھٹیوں میں گاؤں جاتے تھے تو وہاں ایبٹ آباد میں اس کے اسکول کھلے ہوتے تھے اور جب اس کی چھٹیاں ہوتیں تو ہمارے اسکول کھلے ہوتے تھے اور کبھی جو ہم سردیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آتے تو آپ اس کے اور چچی جان کے ساتھ کہیں نہ کہیں گھومنے نکلے ہوتے۔ پھر تو ہم بابا کے ساتھ باہر چلے گئے...... یک دم ہی بابا کا دل یہاں سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ اسفند بھائی کی بھی کبھی ملاقات نہیں ہوگی اس سے......"
"ہوں...... اے لیول کے بعد تو میں نے اسے باہر ہی بھیج دیا تھا۔ جب اس کی چھٹیاں ہوتیں تو میں اور اسما خود ہی چلے جاتے تھے اس سے ملنے......" وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے لگتے تھے۔
"چاچو میں نے پوچھا تھا امان کب تک آئے گا ایسا نہ ہو کہ ہمیشہ کی طرح میں چلا جاؤں اور وہ آئے۔"
"ابھی کنفرم نہیں ہے...... میں چاہتا ہوں کہ پہلے یہاں کے معاملات طے ہوجائیں...... پھر اسے بلاؤں...... ظاہر ہے ابا جان ہاریوں کے نام زمین کرنے پر بہت شور مچائیں گے...... حالانکہ وہ زمین جو ہم دیں گے وہ ابا جان کی نہیں ہے پھر بھی بہت ہنگامہ کریں گے تو...... اسے صرف پندرہ، سولہ دن کی چھٹی

digest novels lovers group

ملے گی تو اس چھٹی میں اپنے معاملے نمٹا کر... میں سکون سے اس کا کام نبٹا سکوں...... اللہ کرے خاموشی سے اور آسانی سے سب کام ہو جائے اور کوئی ہنگامہ نہ ہو۔"

"کیا مطلب چاچو...... کیسا ہنگامہ...... کیا اس کی زمین کے کوئی اور دعویدار بھی ہیں؟" وہ حیران ہوئے۔

"دعویدار نہیں غاصب......" تنویر علی کی آنکھوں سے کرب جھلکا تھا...... وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے...... پھر انہوں نے سر اٹھایا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہیں۔

"تیمور...... جو بات میں تمہیں بتانے والا ہوں وہ آج تک کسی کو نہیں بتائی لیکن میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ......" وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر خاموش ہو گئے تھے...... جیسے تذبذب میں ہوں...... پھر لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے آہستگی سے بولے۔

"ہمارا امان اللہ...... شاہ میر بھائی کا بیٹا ہے۔ جو گم ہو گیا تھا۔"

"آپ کا امان اللہ، شاہ میر تایا کا بیٹا......؟"

تیمور علی حیران ہوئے تھے۔ انہیں تو امان کا پورا نام بھی آج ہی معلوم ہوا تھا۔

"ہاں......" تنویر علی نے ایک گہری سانس لی۔

"جب ہمیں پتا چلا کہ اسما کے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی تو ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کوئی بچہ اڈاپٹ کر لیں گے...... اس کے لیے ہم نے مختلف یتیم خانوں اور ایدھی سینٹر کا وزٹ کیا اور اپنا نام درج کروایا، دو تین جگہوں پر کہ اگر بچہ مل سکے تو ہمیں اطلاع دے دیں۔ یہ تب کی بات ہے جب شاہ میر بھائی کے بیٹے کو اغوا ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ہمیں امید دلاتے رہے کہ شاید علاج سے اسما کو جو پرابلم ہے ٹھیک ہو جائے...... لیکن پھر یہاں کے ڈاکٹروں نے اور باہر کے ڈاکٹروں نے بھی مایوس کر دیا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ اگرچہ ابا جان اس کے خلاف اور دوسری شادی کے حق میں تھے انہوں نے ...دیا تھا کہ وہ کسی غیر کی اولاد کو اپنی اولاد تسلیم نہیں کریں گے لیکن ہم اپنے فیصلے میں اٹل تھے۔ ایک سال بعد ایک یتیم خانے سے فون آیا کہ چھ ماہ کا ایک بچہ ہے جس کی ماں مر چکی ہے اور باپ اسے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ آپ ساری فارملیٹیز پوری کر کے لے جائیں...... وہاں ہمیں...... وہ شخص ملا جسے چند بار ابا جان کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے اور تیمور اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ اس قدر اذیت ناک اور تکلیف دہ تھا کہ مجھے لگتا تھا شاید میرا دل دھڑکنا چھوڑ دے گا۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے تھے یوں جیسے وہ اذیت آج بھی انہیں تکلیف دے رہی ہو۔

"جانتے ہو ابا جان نے شاہ میر بھائی کے بیٹے کو خود اس شخص کے حوالے کیا تھا کہ اسے مار کر جنگل میں پھینک دے۔ درندے اس کی لاش چیر پھاڑ کر خود ہی اس کا نام و نشان مٹا دیں گے لیکن اللہ نے اس شخص کے دل میں رحم ڈالا اور وہ اسے مارنے کے بجائے اس یتیم خانے میں چھوڑ گیا۔ اس نے ہی مجھ سے کہا کہ کسی غیر کا بچہ پالنے کے بجائے آپ اپنے بھائی کا بچہ ہی پال لیں۔ اس شخص نے بتایا کہ میں نے یتیم خانے کے انچارج سے کہا تھا کہ جب میرے حالات بہتر ہوئے تو اسے لے جاؤں گا...... میں نے کچھ رقم بھی جو بڑے صاحب نے مجھے انعام میں دی تھی۔ اس کی ضروریات کے لیے دے دی تھی۔ آج میں اسے لینے آیا تھا کہ اسے اپنی بیوہ بہن کو دے دوں گا جو بے اولاد ہے۔ لیکن شاید اللہ کو یہ منظور نہیں تھا تب ہی میرا سامنا آپ سے ہو گیا تو میرے دل میں خیال آیا کہ اسے ایک غریب کے جھونپڑے میں پلنے کے بجائے وہاں پلنا چاہیے جہاں پلنے کا حقدار ہے یہ۔ لیکن اگر آپ اسے نہ لے جانا چاہیں تو میں اسے اپنی بہن کے لیے لے جاؤں گا...... لیکن خدا کے لیے کبھی بڑے صاحب کو یہ بات معلوم نہ ہو ورنہ مجھے تو مروا ہی دیں گے لیکن میرے خاندان والوں کا بھی جینا حرام کر دیں گے۔"

وہ بات کرنے کے بعد بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ابا جان کو کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ شاہ میر بھائی کا بیٹا زندہ ہے...... وہ بے حد کمزور اور بیمار لگ رہا تھا اس کی سرخ و سفید رنگت دو سالوں میں نیالی سی ہو گئی تھی۔ وہ بہت سہما ہوا سا تھا۔ ہم اسے گھر لے آئے مجھے ڈر تھا کہ کہیں ابا جان اسے پہچان نہ لیں...... لیکن ابا جان نے تو اسے دھیان سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ بس ناراضی کا اظہار کر کے چلے گئے تھے۔ اس کی شاہ میر بھائی سے بہت مشابہت تھی۔ ذرا اس کی صحت بہتر ہوتی تو اگر ابا جان کی اس پر نظر پڑتی تو انہیں اسے پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ تو کچھ دنوں بعد ہی ہم اسے لے کر لاہور چلے گئے اور میں نے ایک جگہ جاب کر لی۔ اگرچہ ابا جان اس پر بہت ناراض ہوئے تھے۔ جب اس کی صحت بہتر ہو گئی اور اتنا بڑا ہو گیا تو ہم نے اسے ایبٹ آباد میں داخل کروا دیا۔ اس کی ساری تعلیم ہاسٹلوں میں ہی رہ کر ہوئی جب اس کی چھٹیاں ہوتیں تو ہم کوئی فرنشڈ اپارٹمنٹ لے لیتے کبھی لاہور کبھی کراچی اور پھر اے لیول کے بعد ہم نے اسے باہر بھیج دیا۔ اس دوران میں شاہ میر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے ان کا تڑپنا، صبا بھابی کا رونا، ان کی اذیت بھولتی نہیں تھی۔ ہر نماز میں دعا کرتا لیکن شاید اللہ کو ہی منظور نہ تھا۔ ہمیں امان سے بہت محبت ہے بیٹا۔ تمہاری چچی کی تو جان ہے اس میں پھر بھی ہم نے شاہ میر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوششیں ترک نہیں کیں...... پھر اس روز وہ اچانک نظر آ گئے۔ اور میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انہیں امان کی زندگی کی نوید دی تھی۔ ''وہ آپ کی امانت ہے، میں بہت جلد اسے لے کر آپ کے پاس آ رہا ہوں...... وہ مجھے کیسے اور کہاں ملا تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے...... وہ امریکا میں ہے۔ ہم ابھی اسی کے پاس جا رہے ہیں...... لیکن شاہ میر بھائی ابھی بھابی کو یہ مت بتایئے گا کہ وہ میرے پاس ہے...... ماں ہیں صبر نہیں کر سکیں گی اور شاید ضد کر کے گاؤں چلی جائیں یا کسی سے کہہ دیں...... آپ کا بیٹا ڈاکٹر بن رہا ہے۔ اس کے پیپرز ہونے والے ہیں اور اسما ہمیشہ اس کے ہر امتحان میں اس کے پاس ہوتی ہے کہ اس کا خیال رکھے اور وہ بے فکر ہو کر اپنا پڑھے۔ اب بھی ہم اس کے پیپرز ختم ہونے تک رکیں گے۔ ابھی اسے بھی ہم کچھ نہیں بتائیں گے کہ وہ ڈسٹرب ہو جائے گا۔'' اور انہوں نے کہا تھا۔

''جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں تین چار ماہ اور سہی...... لیکن دیرو میرے بھائی زیادہ دیر تک مت کرنا...... ہم پھر اس کے پیپرز ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ شاہ میر بھائی چلے گئے۔ میں تو اذمیر بھائی کو بھی نہ بتا سکا کہ امان، شاہ میر بھائی کی گم شدہ متاع ہے۔ سوچا تھا جب اسے لے کر شاہ میر بھائی کے پاس پاکستان جاؤں گا تو تب ہی انہیں بھی بتاؤں گا لیکن شاہ میر بھائی چلے گئے اور صبا بھابی ایک بار پھر کھو گئیں...... کیا تمہیں کوئی کھوج ملا ان کا......؟''

انہوں نے جو حیران اور خاموشی سے تنویر چاچو کو بولتے ہوئے سن رہے تھے نفی میں سر ہلایا۔

''کیا امان کو پتا ہے کہ وہ......؟''

''ہاں...... دو سال کا تھا وہ جب ہمارے پاس آیا تھا۔ پھر بڑا ہوتا گیا تب ہم اس سے کہتے تھے کہ وہ گم ہو گیا تھا اور جس شخص کو ملا اس نے اسے وہاں اس ادارے میں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جب اس نے اپنا اے لیول کمپلیٹ کیا اور باہر جا رہا تھا تب ہم نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم نے اسے اڈاپٹ کیا ہے۔ مزید کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ پڑھائی چھوڑ کر اپنے والدین کو تلاش کرنے لگتا...... اور اس نے بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کہا تو صرف اتنا کہ ''وہ کون ہے اسے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ کھوج لگانے کی میرے ماں، باپ آپ ہیں اور میں آپ کا بیٹا ہوں......'' ہم مطمئن ہو گئے تھے کہ اس نے حقیقت کو قبول کر لیا ہے۔ ابا جان نے مجھ سے کہا تھا کہ تم بچہ تو لے رہے ہو لیکن یاد رکھنا لے پالک کا وراثت میں کوئی حق نہیں ہوتا تو میں نے ان سے کہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو اس مقام

digest novels lovers group

پر پہنچادوں گا کہ اسے کسی وراثت کی ضرورت نہیں ہوگی اور آج ماشاء اللہ، اللہ نے اسے اتنا دے دیا ہے کہ اسے کسی زمین، جائداد کا لالچ نہیں ہے۔ پچھلے دنوں جو گھر اس نے وہاں خریدا ہے ہماری حویلی اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ بہت شاندار گھر ہے اور اس کو اس نے بہت خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کیا ہے۔“

”تو آپ اسے پاکستان نہ بلوائیں چاچو اگر دادا جان نے اسے پہچان لیا تو کہیں نقصان نہ پہنچادیں...... آپ کہتے ہیں ناں کہ اس کی شاہ میر تایا سے مشابہت ہے۔“

انہیں سارے حالات سن کر فکر ہوئی تھی کہ کہیں دادا جان پھر اسے نقصان نہ پہنچائیں اور ضروری نہیں کہ قسمت ہر بار ساتھ دے۔

”ہاں کاپی ہے وہ شاہ میر بھائی کی۔ کوئی جو ایک بار بھی شاہ میر بھائی سے ملا ہو اسے دیکھ کر ضرور کہے گا کہ یہ شاہ میر کا بھائی، بیٹا یا بھتیجا ہے۔ لیکن میری جان حق دار کو جان بوجھ کر اس کے حق سے محروم رکھنا بھی گناہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ روزِ محشر میں بھی ابا جان کے ساتھ حق داروں کا حق مارنے والوں کی قطار میں کھڑا ہوں کہ جانتے بوجھتے میں نے شاہ میر بھائی کا حق ان کے بیوی بچوں تک نہیں پہنچایا...... کاش صبا بھابی مل جاتیں تو کب کا کندھوں کا بوجھ ہلکا ہو چکا ہوتا...... میں نے کچھ دن پہلے ابا جان کی سیف سے... شاہ میر بھائی کی جائداد کے کاغذات نکال لیے تھے۔ باغات اور زمین شاہ میر بھائی کے نام ہی ہے۔ ابا جان نے کاغذات میں کوئی ہیرا پھیری نہیں کی۔ مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ شاہ میر بھائی کے والد نے اپنی زندگی میں ہی اپنی جائداد شاہ میر بھائی اور اماں جان کے نام کی تھی یا بعد میں اماں جان نے کروائی۔“

”اماں ڈسٹرب تو بہت ہو جائے گا سب کچھ جان کر......“ وہ اس کے لیے فکر مند ہوئے۔

”ہاں فطری بات ہے لیکن اب یہ ضروری ہو گیا ہے۔ میں اپنے ساتھ، ساتھ ابا جان کے گناہوں کا بوجھ بھی کم کرنا چاہتا ہوں...... وہ بہت مجبور ہے، مجھ جائے گا ہماری مجبوری...... اسے بھی شاہ میر بھائی کی طرح دولت کی ہوس نہیں ہے لیکن اس کا حق اسے ملنا چاہیے پھر وہ جو چاہے کرے...... یہ اماں جان کی تربیت تھی کہ ہم پانچوں بہن، بھائیوں میں سے کسی کو بھی دولت کی چاہ نہیں ہے۔ ہوس نہیں زمین جائداد کی۔ اماں جان نے ہمیشہ ہمیں سمجھایا کہ زمین اور پیسے کی خاطر کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرنا ظلم نہ کرنا کہ یہ سب مال و دولت یہاں ہی رہ جانے والا ہے۔ نہ ہمارے بڑے اسے ساتھ لے گئے تھے، نہ ہم لے کر جائیں گے۔ دونوں بہنوں کو بھی کبھی زمین جائداد کا لالچ نہیں رہا۔ ہاں ان کے مزاج میں تھوڑی سی خود پسندی اور رعونت ہے جو انہیں ابا جان کی طرف سے ورثے میں ملی ہے، ورنہ اماں جان تو بہت نرم مزاج اور عاجزی سی تھیں۔ ہمارے بچپن میں بھی، بھی ابا جان کہتے تھے۔ وہ جنہیں مجھ پر جانا تھا وہ ماں پر چلے گئے۔“ وہ ہولے سے ہنسے تھے۔

”مجھے اماں سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو رہا ہے پہلے بھی تھا لیکن اب اور زیادہ ہو گیا ہے۔ وہ آپ کا ہی نہیں، شاہ میر تایا کا بھی بیٹا ہے۔ بابا کہتے تھے کہ شاہ میر کے مجھ پر بہت قرض ہیں اور تمہیں یہ قرض لوٹانے ہیں۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے کہ تقریباً چھ بجنے والے تھے۔

”چاچو! آپ بھی تھوڑا آرام کرلیں اور پھر باتھ لے کر فریش ہو جائیں۔ آٹھ بجے آپ کو وکیل کی طرف بھی جانا ہے، میں بھی چینج کرلوں۔ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر سے نکلیں گے۔“

تنویر علی بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ تب ہی کرن اپنے کمرے سے نکل کر دوڑتی ہوئی ان کی طرف آئی۔

”دادا ابو...... دادا ابو کیا آپ جا رہے ہیں واپس؟“

وہ ان کو دادا ابو ہی کہتی تھی کہ تیمور علی نے اسے بتایا تھا کہ یہ بھی تمہارے دادا ابو ہیں۔

”آج مجھے ٹیسٹ کی بھی تیاری کرنا تھی اور مجھے ہوم ورک بھی زیادہ ملا تھا ابھی ختم ہوا ہے اور آپ آج واپس نہیں جائیں گے ناں۔“

"نہیں جائیں گے، آج ہم اپنی گڑیا کے پاس رہیں گے۔" انہوں نے جھک کر اسے پیار کیا۔

"اور وہ پودنے اور پودنی والی کہانی بھی سنائیں گے۔" اس نے ان کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"ہاں، وہ کہانی بھی سنائیں گے۔" وہ مسکرائے۔

"اور...... اور لوڈو بھی کھیلیں گے۔"

"ہاں۔" انہوں نے اس کے رخسار کو دو انگلیوں سے چھوا۔

"آپ بہت اچھے ہیں دادا ابو۔"

"مکھن لگایا جا رہا ہے۔" وہ تیمور ملک کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار ہنس دیے۔ وہ ان کی بات کا مطلب تو نہیں سمجھی تھی لیکن ان کے ہنسنے پر اسے لگا جیسے دادا ابو کو لگا ہے کہ وہ ویسے ہی کہہ رہی ہے۔

"سچ دادا ابو، نتاشہ آنٹی بھی کہتی ہیں کہ آپ کے دادا ابو بہت اچھے ہیں بالکل میرے بابا کی طرح جب آپ پچھلی بار آئے تھے تب کہا تھا انہوں نے۔"

"اچھا اور آپ کی نتاشہ آنٹی اور کیا کہتی ہیں۔"

تب ہی کرن کے روم سے نتاشہ باہر نکلی لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی اور پھر انہیں سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی۔"

تنویر علی کو پچھلی بار کی طرح اب بھی لگا تھا جیسے انہوں نے اس بچی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں یہ یاد نہیں آرہا تھا۔ اس کے خدوخال مانوس سے لگے تھے انہیں اور آج دوسری بار بھی ایسا ہی لگ رہا تھا اس لیے بے اختیار پوچھ بیٹھے۔

"مجھے لگتا ہے جیسے میں نے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے، کیا آپ کبھی ہمارے گاؤں گئی ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور کرن کی طرف متوجہ ہوگئی۔ "آپ کا اسکول بیگ میں نے تیار کر دیا ہے اور یونیفارم بھی پریس کر کے ہینگ کر دیا ہے۔ اب آپ نے بیگ نہیں کھولنا، کل کی طرح کوئی بک پھر باہر ہی نہ رہ جائے۔"

اور پھر تیمور علی کی طرف دیکھا جو غیر ارادی طور پر اسے ہی دیکھے جا رہے تھے۔

"سر میں اب جاؤں؟"

"ہاں لیکن مغرب کے بعد آجائیے گا۔ مجھے اور چاچو کو کسی کام سے جانا ہے۔ آپ کرن کو کھانا کھلا کر سلا دیجیے گا۔ مہراں کے کہنے پر یہ نہیں سوئے گی، ہمارے آنے تک جاگتی رہے گی۔"

"جی سر۔"

وہ چلی گئی تو تنویر علی نے کھوجتی نظروں سے تیمور کو دیکھا۔ "اچھی لڑکی ہے مہذب اور بااخلاق سی پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری کرن سے بہت پیار کرتی ہے۔ تم پاکستان سے چلے گئے تو کرن بہت مس کرے گی اسے۔"

"جی...... لیکن جانا تو ہے ناں...... بلکہ میں سوچ رہا ہوں ہم بھی مشی گن ہی شفٹ ہو جائیں گے۔ اماں سے کہیے گا کہ اپنے گھر کے آس پاس ہی کوئی گھر ہمارے لیے بھی دیکھ لے۔ بہت دوریاں دیکھ لیں، جدائیاں سہہ لیں۔ کرن بھی اسما چچی اور آپ کے ساتھ خوش رہے گی۔"

انہوں نے ابھی، ابھی لمحوں میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اب مشی گن میں ہی رہیں گے جہاں بھی چاچو تنویر ہوئے وہاں ہی۔ شکل صورت میں تو نہیں لیکن بات چیت، اٹھنے بیٹھنے اور بہت سی دوسری عادتوں میں وہ بابا کا پرتو تھے۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔" تنویر علی بھی خوش ہو گئے تھے۔

"اب جب بھی اماں سے بات ہوئی تو کہہ دوں گا۔ بہت خوش ہو گا ترسا ہوا ہے رشتوں کا۔"

اور پھر وکیل کی طرف جاتے ہوئے وہاں سے واپس آتے ہوئے وہ مسلسل اسی کے متعلق سوچتے رہے اور انہیں اپنا یہ فیصلہ بالکل صحیح لگا۔ اس طرح کرن کی طرف سے بھی وہ بے فکر ہو جائیں گے۔ کہیں جاتے ہوئے وہ اسے اسما چچی کے پاس چھوڑ جایا کریں گے۔

وکیل سے ساری بات کرنے اور کاغذات وغیرہ تیار کروانے کے بعد وہ تنویر چاچو کو لے کر بڑی پھپو کی طرف چلے گئے تھے۔ یوں بھی کرن سو چکی تھی۔ اس

دوران انہوں نے دوبار گھر فون کر کے مہراں سے پوچھ لیا تھا۔ صبح اسے اسکول جانا ہوتا تھا اس لیے وہ نو بجے تک سو جاتی تھی۔ تنویر چاچو کو صبح کچھ ضروری کام تھے انہوں نے کہا کہ کل شاید آپا سے ملنے کا وقت نہ ملے تو یوں بھی کرن سو چکی ہے تو ابھی آپا سے مل لیتا ہوں۔ چھوٹی آپا سے بھی کہہ دیتا ہوں اُدھر ہی آجائیں۔ یوں بڑی پھپو کے گھر سب ہی ان کا انتظار کر رہے تھے۔ چھوٹی پھپو کا موڈ انہیں تھوڑا خراب لگا تھا لیکن انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ کھانا سب نے اکٹھا کھایا تھا اور کھانے کے دوران ہی ان کی شادی کا موضوع چھڑ گیا۔ جس میں سب نے ہی حصہ لیا۔ البتہ چھوٹی پھپو خاموش رہی تھیں۔ ان کا موڈ کچھ اور بھی خراب ہو گیا تھا۔

"ہمارے ارادے، ہمارے فیصلے اور ہماری سوچیں کیا، اصل حکم اور فیصلہ تو اللہ کا ہے...... بس دعا یہ کرنی چاہیے کہ جو بھی ہو ہماری کرن اور تیمور کے حق میں اچھا ہو۔" آخر کار تنویر چاچو نے یہ کہہ کر بات ختم کی تو تیمور علی نے بھی اطمینان بھری سانس لی کہ وہ مسلسل ایک ہی جیسے مشورے سن، سن کر بیزار ہو چکے تھے۔ بہت عرصے بعد تنویر علی یوں سب کے ساتھ مل کر بیٹھے تھے تو ان کا اٹھنے کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ پھر نہ جانے کب اس طرح کا ماحول اور ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہوتا بھی ہے یا نہیں لیکن تیمور علی کو بے چین دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے پھر بھی گھر آتے، آتے بارہ سے زیادہ ہی ہو گئے تھے۔ تنویر علی کو گیسٹ روم میں چھوڑ کر اور شب بخیر کہہ کر وہ لاؤنج میں آئے اور مہراں سے کرن اور ثناشہ کا پوچھا۔

"جی تاشی بی بی، کرن کے پاس ہی ہیں۔"

وہ ہلکا سا دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہوئے۔ کرن، ثناشہ کے بازو پر سر رکھے اور اپنا بازو اس کے اوپر رکھے سو رہی تھی اور خود ثناشہ بھی شاید اسے سلاتے، سلاتے سو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر یوں ہی دروازے کے پاس کھڑے دیکھتے رہے۔ دل نے بے اختیار خواہش کی کاش یہ منظر وہ ہمیشہ دیکھتے رہیں۔ وقت یہاں ہی کہیں ٹھہر جائے، جامد ہو جائے لیکن پھر فوراً ہی اپنے دل کو ڈپٹا جو فضول کی خواہشوں میں انہیں الجھا لیتا تھا اور وہ تیزی سے واپس پلٹے۔ مہراں لاؤنج میں ہی نیچے کارپٹ پر صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

"مہراں، مس ثناشہ سو گئی ہیں۔ آپ انہیں جگا دیں کہ ٹیکسی چلی جائیں تو میں کرن کو اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

"جی۔"

مہراں ابھی اس کی آنکھوں میں بھی نیند بھری تھی۔

"تاشی بی بی اگر سو گئی ہیں تو ادھر ہی آج کرن بی بی کے پاس سو جائیں۔"

شاید وہ بیل کی آواز پر سوتے سے اٹھی تھی اور ابھی تک نیند میں ہی تھی ورنہ ایسا مشورہ کبھی نہ دیتی۔

"مہراں۔" انہوں نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کتنی عمر ہے؟"

"جی یہ پچاس کے اریب قریب۔" (آس پاس)

"تو ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ کیا مناسب ہے اور کیا نہیں؟"

"جی...... جی۔" مہراں کی سمجھ نہیں آیا تاہم اس کی آنکھوں میں تیمور علی کے لیے احترام تھا، عقیدت تھی۔

"او کے جائیں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔" وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ چند لمحوں بعد ہی ثناشہ دوپٹا اچھی طرح لپیٹتے ہوئے باہر آئی۔ مہراں اس کے پیچھے تھی۔

"سوری مس، ہمیں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں سر۔" اس نے نظریں اٹھائیں۔ نیند سے بھری خمار آلود میں ہلکے سرخ ڈورے تھے۔ غضب کی خوش نما آنکھیں تھیں سحر طاری کرتی کسی دل کو اپنی مٹھی میں لیتیں۔

"کرن نے تنگ تو نہیں کیا، دراصل اس وقت اس کی خواہش ہوتی ہے کہ میں اس کے پاس رہوں۔"

"نہیں، کرن بالکل تنگ نہیں کرتی۔" اس کے لبوں پر لمحہ بھر کو مسکراہٹ آ کر ٹھہری۔ گلابی، گداز خوب

صورت ہونٹوں پر ٹھہری مسکراہٹ انہیں لگا جیسے وہ اس مکان کے سحر سے کبھی نکل نہیں سکیں گے۔ انہوں نے فوراً ہی نگاہیں جھکالیں۔

"پلیز، پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔" اور پھر دروازہ لاک کر کے جب وہ مڑے تو کتنی ہی دیر تک یونہی بے خیالی میں کھڑے رہے۔ کلاک نے ایک بجایا تو وہ چونکے اور کرن کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئے اور اسے اپنے بیڈ پر لٹاتے ہوئے کتنی ہی دیر تک وہ اس کے معصوم چہرے کو دیکھتے رہے۔

"کیا وہ کرن کے لیے نتاشہ کو اپنی زندگی میں شامل کرلیں؟" انہوں نے سوچا۔

"لیکن کیا صرف کرن کی خاطر؟" ان کے چور جذبوں نے چٹکی بھری تھی۔

"تمہارا اپنا دل بھی تو......"

"لیکن مجھے اپنے دل پر اختیار ہے۔" وہ جھنجلائے تھے اور کرن کے پاس لیٹتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ لیکن نیند بہت دیر سے آئی تھی۔ صبح ان کی چونکہ چھٹی تھی اس لیے دیر تک سوتے رہے۔ جب آنکھ کھلی اور سامنے کلاک پر نظر پڑی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، نو بج رہے تھے۔ چاچو کیا کہتے ہوں گے۔ جلدی سے باہر آئے۔ تنویر علی تیار ہو کر لاؤنج میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔

"سوری، چاچو آنکھ ہی نہیں کھلی۔"

"کوئی بات نہیں یار، میں بھی کرن کے جگانے پر اٹھا ہوں۔" انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

"تم نے رات بتایا تھا ناں کہ کل تمہیں آفس نہیں جانا۔"

"جی، وہ آفس میں کوئی کام ہو رہا ہے تو ایک دن کے لیے ورکرز کو چھٹی مل گئی ہے اور کرن تو اسکول چلی گئی ہوگی۔"

"ہاں...... میں بھی دس بجے تک نکلوں گا۔ رفیق ناشتا بنا رہا ہے۔"

"میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں، اس وقت تو کچھ دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ دن میں شاید تمہاری ضرورت پڑے۔" انہوں نے پھر اخبار اٹھا لیا تھا۔ ناشتا کر کے تنویر علی چلے گئے تو وہ ان کے جانے کے بعد کچھ دیر ٹی وی دیکھتے رہے پھر اخبار اٹھا لیا۔ گھر میں دو اخبار آتے تھے انگلش اور اردو، اردو تو دیکھنے کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا تھا بس پاکستان ٹائم کی سرخیوں پر نظر ڈال لیتے تھے۔ لیکن آج پاس پڑا اخبار اٹھایا تو وہ نوائے وقت تھا۔ تنویر علی بھی دیکھ رہے تھے۔ ادبی صفحہ کھلا تھا۔ انہیں شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں تھی لیکن یونہی وقت گزاری کے لیے وہ اس میں چھپی شاعری

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے
بیرون ممالک کے لیے زرسالانہ 30,000 روپے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ:
مرزا ثمر عباس: 0334-5498977
0301-2454188
منیجر محمد شہزاد خان: 0333-2256789
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

پڑھنے لگے تو ایک غزل انہیں اپنے حسب حال لگی۔

''تمہارے کھوج میں اپنا کمال کھو بیٹھے
جواب ڈھونڈ کے لائے سوال کھو بیٹھے
عجب ہجوم تھا بے چینیوں کا سینے میں
ہم اپنی بھیڑ میں تیرا خیال کھو بیٹھے''

انہوں نے زیرلب اشعار کو دہرایا اور پھر اخبار رکھ دیا۔ وہ ایک تصویر جو سات سال پہلے ان کے دل میں ایک مبہم خیال کی طرح تھی اور جس میں وہ خود ہی رنگ بھرتے رہتے تھے۔ اب اس تصویر پر کوئی اور تصویر غالب آتی جارہی تھی اور وہ جیسے بے بس سے ہو رہے تھے۔ وہ اگر مجسم ہو کر سامنے آگئی اور ایسی نہ ہوئی جیسا ان کے تصور نے تراشا تھا تو...... اتنے سالوں بعد جیسے پرانی تصویر کے رنگ مدھم ہوتے جارہے تھے انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کے ذرات شہد کی چھتری ہوئی اور بھڑکی ہوئی مکھیوں کی طرح ایک نئی شکل ترتیب دیے جاتے ہیں جب یہ ذرات منجمد ہو کر ٹھہریں گے۔ ایک صورت ابھار کر، تب کیا ہوگا...... کیا وہ بابا سے کیا وعدہ توڑ دیں گے۔ کیا اس نئی شکل کے رنگ اتنے گہرے ہوں گے کہ وہ موہوم سا خاکہ ان گہرے رنگوں تلے دب جائے گا۔

وہ اپنی سوچوں میں اس طرح محو تھے کہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کب مناشہ دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ مہراں کچھ دیر پہلے ہی باہر گئی تھی صفائی کرنے والی ماسی باہر گیراج اور برآمدے اور گلیوں کی صفائی کروانے۔

''سر......!'' اس نے جھجکتے ہوئے انہیں بلایا تو اپنے خیالوں سے چونک کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور نئی ترتیب پانے والی وائی صورت جیسے مجسم ہو کر سامنے آگئی تھی۔ وہ جیسے خود سے ہی خوف زدہ ہو گئے تھے۔ سوالیہ نظریں لمحہ بھر کے لیے اس کی طرف اٹھ کر جھک گئی تھیں۔

''سر! آپ کو ایک بات بتانی تھی۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''بیٹھ جائیں مس مناشہ اور سکون سے بات کریں۔ کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''سر! وہ کل جب آپ گئے ہوئے تھے رات کو سین صاحبہ کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مہراں سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' وہ لمحہ بھر کو حیران ہوئے تھے کل رات سب بڑی پھپو کے گھر تھے سوائے سین کے تو تب ہی اس نے بات کی ہوگی۔

''کیا کہا سین نے۔ پھر کوئی بدتمیزی کی آپ سے جو بھی کہا ہے بغیر جھجک کے بتائیں۔''

''وہ...... انہوں نے کہا کہ وہ آپ کی منگیتر ہیں اور میں کرن کی آڑ میں آپ......'' وہ جھجک کر خاموش ہوگئی۔ لیکن وہ سمجھ گئے تھے کہ اس نے کیا کہا ہوگا۔

''سین میری منگیتر نہیں ہے۔ البتہ جب کرن کے بابا اور ماما کا حادثہ ہوا تو یہ ذکر ضرور چلا تھا۔ بڑی پھپو وغیرہ نے بابا سے کہا تھا کہ کرن کے لیے اگر میری شادی سین سے ہو جائے تو اچھا ہے بلکہ اصرار بھی کیا تھا انہوں نے لیکن بابا میری شادی کہیں اور طے کر چکے تھے سو انکار کر دیا اور بات ختم ہوگئی تھی لیکن دو سال پہلے جب میں پاکستان آیا تو پھر دادا جان وغیرہ نے اس طرح کی بات کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔''

''کرن آپ کی بیٹی نہیں ہے؟'' ان کی بات سنتے ہوئے بھی اس کا ذہن اسی میں الجھا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کرن ان کی بیٹی ہے اور شاید ان کی وائف کا انتقال ہو چکا ہے۔

''میرے بھائی اور بھابی کا کار کے حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ تب سے کرن میری بیٹی ہے...... پھپو کے اصرار کے باوجود بابا اور میں نے کرن کو ان کے حوالے نہیں کیا تھا۔ ہمارے لیے ہمارا سب کچھ کرن تھی ہمارے جینے کا جواز...... اور پھر بابا بھی چلے گئے اور اب صرف کرن ہے...... میرا اثاثہ...... میری زندگی......'' ان کی آنکھوں سے درد جھلکنے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے لیکن پھر فوراً ہی انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

''ہاں آپ کہیں اور کیا کہا ہے سین نے...... یقیناً کچھ ایسا کہا ہوگا کہ آپ کو مجھ سے بات کرنا پڑی؟''

''وہ......'' اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے

بابا۔ آنکھوں میں نمی سی پھیلی۔ ''انہوں نے کہا ہے کہ
رے لیے بہتر یہی ہے کہ میں آپ کا اور کرن کا پیچھا
چھوڑ دوں تو مجھے کہ کہنا تھا کہ آپ کیسرا بھابی......''
''مس نتاشہ...... میرے خیال میں اس روز آپ
ے بات ہوئی تھی کہ آپ کو کہیں نہیں جانا...... اور آپ
کسی کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ یہ گھر میرا ہے......
رے گھر کے معاملات میں کسی کو دخل دینے کا حق
ہیں۔ میں بین سے بات کروں گا کہ آئندہ......''
''پلیز نہیں...... آپ ان سے کچھ مت کہیں۔ وہ
راض ہوں گی اور نہ جانے کیا، کیا کہیں گی۔ میں ایک
ر ہوں جبکہ وہ آپ کی کزن ہیں...... آپ کا احسان
ہے کہ......''
''کوئی احسان نہیں ہے میرا...... بلکہ آپ جس
ت سے کرن کا خیال رکھ رہی ہیں اس کے لیے میں
پ کا احسان مند ہوں۔ آپ نہ بھی بتائیں تو میں سمجھ
سکتا ہوں کہ بین نے یقیناً بہت کچھ کہا ہوگا۔ اسے عادت
ہے بلاسوچے سمجھے بولنے کی۔ لیکن کرن کی خاطر......
ری بچی بہت ڈسٹرب ہو جائے گی مس نتاشہ......''
انہوں نے اس بار بھی اسے بات مکمل کرنے
نہیں دی تھی۔
''میں خود کرن کے بغیر......'' پلکیں بھیگ گئیں
اور وہ ایک بار پھر نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلنے لگی تھی۔
''اتنے خوب صورت ہونٹوں پر یہ ظلم تو مت
کریں پلیز......'' بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا
تھا اور پھر وہ خود ہی محجوب سے ہو گئے نتاشہ کے رخسار
گل رنگ ہو گئے تھے۔
''سوری، مس نتاشا اگر برا لگا ہو تو کبھی بے اختیار
ہی لبوں سے کچھ ایسا نکل جاتا ہے کہ......'' انہوں نے
اس کی طرف دیکھا لانبی پلکوں کے سائے رخساروں پر
لرز رہے تھے اور جیسے وہاں شفق اتری ہوئی تھی اور وہ
گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی...... کئی
خاموش لمحے دونوں کے درمیان سے گزر گئے۔
''کیا سوچ رہی ہیں آپ؟'' تیمور علی کو خیال ہوا
کہ شاید بین کی وجہ سے وہ یہاں سے جانے کا سوچ
رہی ہے اور کہہ نہیں پا رہی۔
''وہ جن سے آپ کے بابا نے آپ کا رشتہ طے
کیا تھا، آپ نے ان سے شادی کیوں نہیں کی؟''
''تو آپ اتنی دیر سے اس پر غور کر رہی ہیں، میں
تو ڈر گیا تھا کہ شاید آپ نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر
لیا ہے اور سوچ رہی ہیں کہ کیسے کہیں......'' بے اختیار
مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا تھا لیکن پھر فوراً ہی
سنجیدہ ہو گئے۔
''اس لیے کہ وہ دنیا کی اس بھیڑ میں کہیں چھپ گئی
ہے اور میں یہاں پاکستان اسے ہی ڈھونڈنے آیا تھا۔''
''وہ کیسے کھوئی؟'' اب وہ اس کی طرف دیکھ
رہی تھی۔
''وہ مجھ سے نہیں کھوئی بلکہ وہ مجھے ملی ہی نہیں
تھی۔ سات سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا اسے تلاشتے
ہوئے لیکن میں نے ان سارے سالوں میں اپنی امید
کبھی نہیں کھوئی کہ شاید بابا کی اور میری دعائیں بارآور
ہو جائیں لیکن اب میں تھکنے لگا ہوں...... شاید نہ تھکتا اگر
ایک انمول اور انوکھا جذبہ دل کے آتش فشاں سے
پھوٹ نہ پڑتا۔ اس جذبے کی نفی کرتے، کرتے تھک
گیا ہوں نتاشہ۔ اور بابا سے کیے وعدے کی زنجیریں

تعلق

مولانا رومی نے ''تعلق'' کی خوب صورت تشریح
بارش کے قطرے سے کی ہے کہ اگر یہ......
☆ صاف ہاتھوں پر گرے تو پینے کے قابل ہے۔
☆ گٹر میں گرے تو پاؤں دھونے کے قابل نہیں۔
☆ گرم سطح پر گرے تو بخارات بن کر غائب۔
☆ اور Lotus کے پتے پر گرے تو موتی کی
طرح چمکے گا۔
☆ سیپی کے اندر گرے تو موتی بن جاتا ہے۔
قطرہ وہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس کا ''تعلق''
کس سے رہا ہے۔

از: ردا سعادت، کراچی

توڑنے کی ہمت بھی خود میں نہیں پاتا...... جذبے اور سوچیں ایک دوسرے سے لپٹ، لپٹ کر عجیب سے احساسات جگاتی ہیں...... میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں مس لتاشہ...... پتا نہیں کب، کیسے اور کیوں آپ میرے دل میں اتر آئیں شاید کرن سے آپ کی محبت یا کرن کی آپ سے محبت نے مجھے متاثر کیا یا خود میرا دل ہی باغی ہو گیا تھا۔'' وہ مر دتھے اظہار سے خود کو نہ روک سکے تھے کب تک اپنے جذبوں کی نفی کرتے۔

''شاید میں آپ سے یہ سب کبھی نہ کہتا۔ مجھے کہنا ہی نہیں تھا لیکن کوئی وقت ہوتا ہے جب آدمی بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اختیار کی لگامیں ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہیں۔ میں اظہار کر کے بدلے میں آپ کی محبت طلب نہیں کر رہا۔ بس ایک بے اختیار لمحے میں جذبے عیاں ہو گئے۔ آپ بھی بھول جائیے گا کہ میں نے ایسا کچھ کہا تھا۔ میں نارسائی کے اس سفر میں آپ کو شریک نہیں کرنا چاہتا کہ یہ سفر نارسائی سے شروع ہو کر نارسائی پر ہی ختم ہو گا کہ میرے ہاتھ بابا سے کیے وعدے کی زنجیروں سے بندھے ہیں اور میں خواہش کے باوجود ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا...... بے اختیاری کے ان لمحوں کے لیے مجھے معاف کر دیجیے گا۔''

''سر پلیز ایسا مت کہیں...... آپ نے ایسا کچھ نہیں کہا جس کے لیے آپ معافی مانگ رہے ہیں۔''

اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور عین اس لمحے انہوں نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا اور لمحہ بھر کے لیے وہ مبہوت سے ہو گئے تھے۔ چہرے پر جیسے بہاروں کے سارے ہی رنگ اتر آئے تھے اور نم آنکھیں کبھی.... بے تحاشا چمکنے لگتیں کبھی اداسی کی گھٹا سی چھا جاتی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ یونہی اسے مبہوت سے دیکھتے رہتے کہ لاؤنج میں پڑے فون کی بیل بجی تو وہ چونکے اور وہ بھی لمحوں کے اس فسوں سے آزاد ہو کر اٹھی تھی...... اور ایک گہری سانس لے کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی کہ اسے تو خود خبر نہیں ہوئی تھی کہ نہ جانے کب نارسائی کے اس سفر میں وہ ان کے ہم قدم ہو گئی تھی۔

''یہ کیا ہو گیا تھا وہ کیوں ضبط کھو بیٹھے تھے کیوں اسے اپنی نارسائی میں شریک کر لیا۔'' اس کی آنکھوں میں جلتے دیوں اور رخساروں پر بکھرتے رنگوں نے بتایا تھا کہ جو جذبے ان کے دل سے پھوٹے ہیں ان کی تاب اس تک بھی پہنچی ہے۔'' کاش ایسا نہ ہوتا۔ سب چھپا رہتا۔ کچھ عیاں نہ ہوتا۔''

اسے جاتا...... دیکھ کر انہوں نے سوچا اور فون کی طرف بڑھ گئے۔ تنویر چاچو کا فون تھا انہوں نے انہیں گھنٹے بھر بعد اپنے وکیل کے چیمبر میں بلوایا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر تنویر چاچو انہیں ایک دوست کے ہاں لے گئے تھے جن کے ایک کزن شاہ میر کے دوست تھے۔

''آج ہی اپنے دوست سے ملنے گیا تو یونہی باتوں، باتوں میں ذکر ہوا شاہ میر بھائی کا تو اس نے بتایا کہ اس کے چچازاد بھائی ان کے بہت اچھے دوست تھے اور ان کی شادی میں بھی شریک ہوئے تھے تو میں نے اس سے کہا تھا وکیل کے پاس سے ہو کر اس کے پاس آتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے ساتھ لے کر اس کے کزن کی طرف چلتے ہیں شاید کوئی کھوج مل جائے۔'' اور تنویر چاچو کے دوست کے کزن قریب ہی گاؤں میں کسی کی تعزیت کے لیے گئے ہوئے تھے۔

وہاں سگنل بھی نہیں مل رہے تھے۔ بمشکل اتنی ہی بات ہوئی کہ انہیں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا واپس آنے میں۔ انہوں نے مہراں کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ شاید انہیں دیر ہو جائے۔ کرن بھی اسکول سے آچکی تھی۔ انہوں نے اس سے بھی بات کی دل بے اختیار چاہا کہ اس سے بھی بات کر لیں۔ لیکن پھر مہراں کو ہدایات دے کر انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے تنویر چاچو کے دوست کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ تنویر علی بہت پُرامید تھے۔

''یار، تیمور لگتا ہے اس بار ضرور کوئی نہ کوئی کھوج مل جائے گا۔''

''پتا نہیں، مجھے تو ہر بار ایسا ہی لگتا ہے لیکن۔'' وہ بے حد افسردہ لگ رہے تھے۔ دل کہہ رہا تھا کہ اب

نہیں، اب ان کا کھوج نہ ہی ملے اور وہ اس آواز کو سننا نہیں چاہ رہے تھے اور بے دردی سے اپنے ان چور خیالات کو چھوڑ رہے تھے۔

"لیکن پتا نہیں کیوں دل کو یقین سا ہے کہ ہمیں اب صبا بھابی کا پتا مل جائے گا۔ بہت دعائیں کی ہیں میں نے اور اللہ ہماری دعائیں سنتا ہے۔ کبھی جلدی کبھی دیر سے...... اب دیکھو میرا کوئی ارادہ نہیں تھا ظفری سے ملنے کا...... بالکل غیر ارادی طور پر صبح اس کی طرف چلا آیا۔ وکیل صاحب کو کچھ دیر تھی تو گھر بھی واپس جا سکتا تھا آپا کی طرف جا سکتا تھا لیکن ظفری کی طرف چلا آیا تو ضرور یہ اللہ کی طرف سے ہی تھا۔" ان کے دل کی کیفیت سے بے خبر وہ خوشی، خوشی کہہ رہے تھے۔

"ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ کلیو ضرور ملے گا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ ایک دوست تھے شاہ میر بھائی کے جو ہر جگہ ساتھ تھے ان کے۔ نام تو مجھے معلوم نہیں لیکن جیسا کہ ظفری نے بتایا تو دل کہہ رہا ہے ان شاء اللہ کوئی کھوج مل جائے گا۔"

"ان شاء اللہ۔" انہوں نے بھی آہستگی سے کہا تھا لیکن انہیں لگا تھا جیسے یہ ایک لفظ کہنے میں انہیں صدیاں لگ گئی ہوں اور پھر تنویر علی کے دل کا یقین سچ ہوا تھا وہ جانتے تھے۔

"شاہ میر کی بیگم کے وہ کزن آزاد کشمیر میں ہوتے ہیں مظفر آباد یا میر پور میں، مجھے ٹھیک سے علم نہیں لیکن میرے ایک جاننے والے گجرات میں ہوتے ہیں، ان کے کاروباری تعلقات تھے ان سے تو ان کے گھر کا ایڈریس وغیرہ ایک دو روز تک معلوم کرلوں گا۔"

"کیا آپ کے پاس ان جاننے والوں کا فون نمبر نہیں ہے؟" تنویر علی نے بے تابی سے پوچھا تھا۔

"نہیں، لیکن مجھے کل گجرات جانا ہے ان شاء اللہ...... ان سے ملاقات کروں گا۔ ان کی شاپ پر میں دو تین بار گیا ہوں۔"

تنویر علی بہت خوش تھے منزل قریب آنے کی خوشخبری ان کے چہرے اور لہجے سے جھلکتی تھی لیکن تیمور خاموش تھے انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ خلا میں لٹک رہے ہوں۔ جب وہ امید کھونے لگتے تھے کوئی فیصلہ کرنے کا سوچتے تھے تو پھر سے امید زندہ ہو جاتی۔

"کیا تھا اگر انہوں نے ثناشہ سے وہ سب نہ کہا ہوتا۔ کاش اب بھی وہ ضبط کا دامن نہ چھوڑتے اور...... کاش اس نے اپنی آنکھوں میں کوئی خواب نہ سجایا ہو...... پر یہ لڑکیاں تو ایسی ہی پاگل ہوتی ہیں۔ محبت کے دو بولوں سے پگھل جانے والی...... خوابوں کے محل تعمیر کرلیتی ہیں......"

وہاں سے وہ پہلے چھوٹی پھپو اور پھر بڑی پھپو کی طرف گئے تھے۔ تنویر چاچو کو دادا جان کے تمام وارثوں کے شناختی کارڈ نمبر وغیرہ چاہیے تھے۔ وکیل نے تمام ورثا کے کوائف مانگے تھے۔ چھوٹی پھپو کے گھر وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرے تھے۔ ثمین کا موڈ ٹھیک نہیں تھا وہ سلام کر کے چلی گئی تھی۔ البتہ چھوٹی پھپو نے کرن کا پوچھا تھا اور کہا تھا کہ اسے بھی ساتھ لے آتے خوش ہو جاتی۔

"وہ اپنی آنٹی ثناشہ کے ساتھ زیادہ خوش رہتی ہے ویسے بھی پہلے ہمیں وکیل کی طرف جانا تھا۔" انہوں نے جان بوجھ کر کہا تھا۔

"ارے کیا وہ ابھی تمہاری طرف ہی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ وہ چلی گئی ہے۔" چھوٹی پھپو نے حیرانی سے ثمین کی طرف دیکھا تھا۔ جو پیشانی پر بل ڈالے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ بڑی پھپو کے گھر انہیں کچھ دیر ہو گئی تھی۔

"یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو ویرے......"

"کچھ نہیں آپا بس اپنی وراثت سے آپ لوگوں کے حق میں دستبردار ہو رہا ہوں۔ میں اور اسما امریکا جا رہے ہیں اماں کے پاس۔ وہاں ہی سیٹل ہونے کا ارادہ ہے۔" انہوں نے سوچا کہ بڑی آپا کو بتا ہی دیں۔

"پاگل ہو گئے ہو ویرے! ہمیں تمہاری زمین کی چاہ نہیں ہے۔" بڑی پھپو کو ان کا فیصلہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"کمال ہے آپا، ابا جان کی بیٹی ہو کر آپ کو زمین جائداد سے دلچسپی نہیں۔" وہ ہولے سے ہنسے تھے جبکہ

سی ہنسی۔

''نہیں ہے، دلچسپی مجھے زمین جائیداد سے پہلے شاہ میر بھائی چلے گئے پھر ازمیر بھائی پردیس جابیٹھے اور اب تم...... تم اماں کو ہی یہاں کیوں نہیں بلا لیتے...... وہ گاؤں میں نہیں رہنا چاہتا تو اسلام آباد میں گھر لے لو...... یہاں گوجرانوالہ میں تمہارا گھر خالی پڑا ہے۔''

یوں بحث، مباحثے میں دیر ہوگئی وہ مغرب پڑھ کر ہی وہاں سے نکلے تھے...... تیمور علی خاموشی سے ڈرائیو کررہے تھے۔ تنویر علی نے ذرا سا رخ موڑ کر انہیں دیکھا۔

''تم اتنے خاموش اور چپ چاپ سے کیوں لگ رہے ہو؟''

''پتا نہیں...... شاید تھک گیا ہوں یا پھر امیدوں کے بار، بار پیدا ہونے اور ٹوٹنے سے ڈرتا ہوں۔ یہ خلا میں لٹکنے کی کیفیت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے چاچو...... اس سے تو اچھا ہوتا ہے کہ خلا میں لٹکنے کے بجائے ہاتھ چھوڑ کر ایک ہی بار زمین سے ٹکرا کر پاش، پاش ہو جائے بندہ۔'' وہ خود اس وقت اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھے پہلے جب بھی کوئی امید کا سرا ملتا تو اندر خوشی سی بکھر جاتی تھی لیکن آج......

''کیا کوئی اور بات بھی تمہیں پریشان کررہی ہے مور......'' تنویر علی نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ مسکرا دیے۔

''نہیں چاچو...... ایسا تو کچھ نہیں ہے۔'' وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے تھے۔ پتا نہیں وہ مطمئن ہوئے تھے یا نہیں لیکن پھر گھر تک انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ہاں کبھی، کبھی بہت غور سے انہیں دیکھتے...... گھر میں چھوٹی پھپو کی گاڑی دیکھ کر وہ چونکے۔

''کیا سبین...... ان کے بڑی پھپو کے گھر جانے کے بعد ادھر آئی ہے؟'' ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا انہیں اس کی آمد کے مقصد کو سمجھنے میں، وہ تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اندرونی دروازے تک آئے تھے جو اندر سے لاک نہیں تھا اور ان کے دھکیلنے پر کھلتا چلا گیا تھا۔ لاؤنج سے سبین کی آواز آرہی تھی۔ وہ کن روم میں رکے بغیر لاؤنج میں آئے تھے۔ وہ کرن کے روم کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ رنگ سفید ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں گھٹائیں امڈ رہی تھیں۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں تلے کچل رہی تھی۔ کرن اس کا ہاتھ تھامے اس سے جڑی کھڑی تھی۔ سہمی ہوئی سی لیکن انہوں نے دیکھا اس نے نتاشہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ مہراں کچن کے دروازے میں حیران پریشان سی کھڑی تھی۔

''سبین آنٹی! میں بابا کو بتاؤں گی سب کہ آپ نے نتاشہ آنٹی سے لڑائی کی ہے۔'' اس کی سہمی ہوئی سی آواز انہوں نے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی سنی تھی۔

''کرن میرا بچہ کیا ہوا؟'' وہ سبین کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھے تھے لیکن کرن ان کی طرف نہیں بڑھی تھی، وہ کسی جانثار سپاہی کی طرح نتاشہ کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا......'' جواب سبین نے دیا تھا۔

''میں نے ان محترمہ سے کہا تھا کہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر یہاں سے چلی جائیں لیکن یہ ابھی تک یہاں ہی براجمان ہیں...... آپ نہیں جانتے تیمور......'' اب وہ تیمور کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ پاکستان میں زیادہ نہیں رہے، یہاں اس طرح کی مکار اور دھوکے باز لڑکیاں کیسے گھروں میں گھس کر اپنی جھوٹی محبت کے جال میں اچھے بھلے بھولے مردوں کو گرفتار کرکے زمین، جائیداد سب اپنے نام کروا کے لوٹ لاٹ کر چلی جاتی ہیں۔''

''بس اب اور نہیں......'' نتاشہ، کرن کا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھی تھی۔

''بس ایک لفظ اور مت کہیے گا...... میں اس باپ کی بیٹی ہوں جس نے اپنی ساری زمین جائیداد چھوڑ کر گمنامی کی زندگی گزار دی تھی۔ وہ ایسے دس گھر خرید سکتا تھا لیکن پیسے اور جائیداد کی محبت اس کے خمیر میں نہیں تھی۔''

''اچھا......!'' سبین تمسخر سے ہنسی۔

"کیا تمہارا کوئی باپ بھی ہے...... تم جیسی گھٹیا خاندان کی لڑکیوں کو اپنے باپوں کے نام کا علم تک نہیں ہوتا۔"

"سین......!" تیمور علی دھاڑے تھے اور تنویر علی جو تیمور کے پیچھے ہی اندر آئے تھے بے اختیار اس کی طرف بڑھے تھے۔

"سین...... لگام دو اپنے زبان کو کیا تمہیں کسی کی عزت کا خیال نہیں ہے۔"

لیکن وہ سین جلال تھی جس کے متعلق اس کے بھائیوں کی رائے تھی کہ بھڑوں کے چھتوں کی طرح اگر ایک بار چھڑ جائے تو پھر اسے روکنا مشکل ہو جاتا ہے...... دو چار کو ڈنگ مار کر ہی جان چھوڑتی ہے...... اس لیے اسے نہ چھیڑا جائے تو اچھا ہے۔

"عزت...... عزت دار لوگوں کی ہوتی ہے ماموں...... ان جیسوں کی نہیں جن کا کوئی گھر ہے نہ والدین جو بہانہ بنا کر لوگوں کے گھروں میں گھستی ہیں۔" اس نے نتاشہ کی طرف اشارہ کیا۔ اب نہ جانے رفیق یا کریم سے اسے کچھ سن گن ملی تھی یا مہراں نے اسے بتایا تھا لیکن جس طرح وہ اعتماد سے سر اٹھائے مغرور سی کھڑی تھی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ نتاشہ کے متعلق کچھ نہ کچھ وہ جان گئی تھی۔

"سین جاؤ یہاں سے نکل جاؤ اس سے پہلے کہ میں کچھ غلط کہہ دوں۔" تیمور ملک نے خود کو شاک سے نکالا تھا۔

"چلی جاؤں گی پہلے اسے نکالیں۔" وہ استحقاق سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ہاں تو مس نتاشہ نا معلوم کب جا رہی ہیں آپ یہاں سے؟" وہ اب اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ شاید وہ آخری بازی کھیلنے آئی تھی۔

"میں سین جلال ہوں اور تم...... کیا تم نے جعلی ماموں کی طرح باپ کا بھی کوئی جعلی نام گڑھ لیا ہے تو جانے سے پہلے بتا دو۔" وہ تمسخر اڑاتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سین کو ہاتھ پکڑ کر لاؤنج سے باہر نکالتے نتاشہ بالکل اس کے مقابل آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکلے تھے۔

"میں نتاشہ شاہ میر علی ہوں...... میرا باپ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ کروڑوں کی جائداد کا مالک...... شاہ میر علی، میرے دادا کا نام ملک شمشیر علی ہے۔" اس نے ساکت کھڑے تیمور علی خان پر ناراض سی نظر ڈالی۔ جنہیں اپنی اسناد کے لیے اس نے تمام کوائف لکھ کر دیے تھے۔ نہیں جانتی تھی کہ جب اسے کرن کے لیے رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو انہوں نے بغیر دیکھے ہی وہ کاغذ دراز میں ڈال دیا تھا۔

"مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔ لیکن اس لیے بتا رہی ہوں کہ کبھی آپ کا ضمیر جاگے تو آپ کو احساس ہو کہ آپ نے بہتان لگا کر کتنا بڑا گناہ کمایا ہے۔ میں شاید اسی روز چلی جاتی جب پہلی بار آپ نے کہا تھا لیکن کرن کے لیے میں رک جاتی تھی کرن کی خاطر......" آواز بھرا گئی تھی۔

"نتاشہ۔"

تنویر علی اور تیمور علی ایک ساتھ اس کی طرف بڑھے تھے۔

"تم نتاشہ ہو شاہ میر بھائی کی بیٹی؟"

"یہ جھوٹ بول رہی ہے اس نے ضرور شاہ میر ماموں اور نانا جان کا نام کہیں سے سن لیا ہے، اس کی امی کا نام پوچھیں؟" سین کی آواز میں لرزش تھی کمزوری آواز......

"جب مجھے یہاں رہنا نہیں ہے تو مجھے جھوٹ بولنے کی بھی ضرورت نہیں اور میری اماں کا نام صبا شاہ میر ہے اور میرے نانا سید قاسم علی اسکول ہیڈ ماسٹر کی پوسٹ سے ریٹائرڈ ہوئے تھے اور بھی کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لیں۔"

اور تنویر علی نے آگے بڑھ کر نتاشہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا اور اس کے سر پر پیار کرنے لگے۔

"میری بیٹی...... میرے شاہ میر بھائی کی بیٹی...... کہاں کھو گئی تھیں تم...... کتنا تلاشا تمہیں...... تمہیں کھوجتے، کھوجتے تھکنے لگے تھے ہم۔" وہ رو رہے

تھے۔ تیمور ملک کی نظر اچانک کرن پر پڑی تھی۔ جو دروازے سے اب بھی ٹیک لگائے کھڑی تھی اور خاموشی سے روئے جارہی تھی۔

''کرن.....'' تیمور علی نے اسے اٹھالیا تو ان کا سہارا پا کر وہ زور، زور سے رونے لگی۔ اس کے رونے پر تنویر علی اور نتاشہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ سبین کب خاموشی سے چلی گئی۔ یہ انکشافات کی رات تھی، ان انکشافات میں آنسو بھی تھے اور مسکراہٹیں بھی...... وہ ہنسے بھی تھے اور بچھڑ جانے والوں کی یاد میں بے تحاشا روئے بھی تھے۔ نتاشہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ تین سال کی عمر میں کھو جانے والا اس کا بھائی جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہیں تھا یوں اس طرح مل جائے گا۔

''اماں ہوتیں تو کتنا خوش ہوتیں...... بابا نے اپنی موت سے پہلے یہ یقین انہیں سونپا تھا کہ ان کا مان زندہ ہے اور محفوظ ہاتھوں میں ہے اور اماں نے اپنا یقین اس کے پلو سے باندھ لیا تھا۔'' وہ بولی۔

''اماں کہتی تھیں وہ بابا جیسا ہے۔ بڑا ہو کر تو بالکل ان جیسا لگنے لگے گا۔'' اس نے روتی آنکھوں سے بتایا تھا۔

''ہاں وہ بالکل شاہ میر بھائی کی کاپی ہے۔'' تنویر علی نے اپنی نم آنکھیں پونچھ کر اسے فون کیا تھا۔ وہاں اس وقت صبح تھی اور وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

''امان بیٹا..... آج ہی پہلی دستیاب فلائٹ سے اپنی سیٹ بک کراؤ اور کنفرم کروا کے مجھے فون کر دو۔''

''خیریت بابا، ماما تو ٹھیک ہیں۔''

''ہاں تمہاری ماما ٹھیک ہیں بس تم فوراً آجاؤ۔''

''پاکستانی ماں باپ کی طرح کہیں آپ نے بھی میری عمر قید کا بندوبست تو نہیں کر رکھا کہ جاتے ہی جذباتی بلیک میلنگ سے گلے میں عمر قید کا پٹا ڈال دیں۔ ویسے عمر قید تو کیا آپ پھانسی پر لٹکنے کا حکم بھی دیں گے تو یہ سر حاضر ہے۔'' وہ ذرا سا شوخ ہوا تھا۔

''ارے ایسا کچھ نہیں ہے میری جان بس آجاؤ تم۔'' وہ ہنسے تھے۔

''پتا نہیں کتنی مدتوں بعد میں نے آپ کی ہنسی میں یہ چہکار سنی ہے۔ بابا...... کیا مل گیا ہے آپ کو؟''

''بہت کچھ، بس تم آجاؤ جتنی جلدی ممکن ہے۔ آفس سے چھٹی لو اور فوراً سیٹ بک کروالو۔''

کال کٹ گئی تھی انہوں نے دوبارہ پھر کال نہیں کی تھی۔

کرن، نتاشہ کی کمر کے گرد بازو لپیٹے اس کی گود میں ہی سو گئی تھی۔ تنویر چاچو کو تیمور علی نے زبردستی رات دو بجے سونے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ غیر متوقع فلمی سی سچویشن انہیں حیران کیے ہوئے تھی۔ باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں وہ شاہ میر بھائی کی باتیں سننا چاہتے تھے اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ صرف امان اللہ کی باتیں کرتے رہیں۔ اماں کے مان اور بابا کے امن کی۔

مہراں کی پیشی بھی ہوئی تو پتا چلا کہ رفیق بھائی سے جب سبین نے ہرا پھرا کر سوال کیے کہ کیسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہ کر نتاشہ نے اتنی تعلیم حاصل کی۔ اپنی گفتگو سے وہ گاؤں کی نہیں لگتی وغیرہ، وغیرہ تو رفیق بھائی کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا تھا کہ وہ ان کی بھانجی نہیں ہے۔ بس پھر سبین نے سب کچھ اگلوا لیا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ ایسا کر سکتی تھی انہوں نے صبح رفیق سے باز پرس کرنے کا خیال چھوڑ دیا تھا کہ یہ سب اللہ کی طرف سے تھا اگر سبین کو رفیق نے یہ سب معلوم نہ ہوتا تو شاید وہ اسے ابھی کھوج رہے ہوتے۔

''آپ بھی جا کر سو جائیں نتاشہ، بہت ٹینشن بھرا وقت گزارا ہے آپ نے آج۔ لائیں اسے میں بیڈ پر لٹا دوں اور آپ بھی کرن کے کمرے میں ہی سو جائیں۔'' تنویر علی کے جانے کے بعد انہوں نے نتاشہ سے کہا اور جھک کر اس کی گود سے کرن کو اٹھایا تو وہ جھجکتی ہوئی سی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آجائیں اور یقین رکھیں میں ایک شریف آدمی

ہوں۔ دروازہ اندر سے لاک کر لیجیے گا۔'' ایک شرارت بھری مسکراہٹ ان کے لبوں کے کونے پر چمکی تھی۔

''یقین اور اعتبار تو مجھے اس وقت بھی تھا جب آپ سے کوئی رشتہ نہیں تھا اور اب تو اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے...... جبکہ ساتھ والے روم میں میرے چاچو بھی موجود ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر بھی شریر مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی تھی۔

''سچ بتائیں کیا آپ نے کبھی اپنے اس کزن کے متعلق سوچا جس کے ساتھ آپ کے بابا نے آپ کا رشتہ طے کیا تھا؟'' کرن کو بیڈ پر لٹاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''بہت کم۔'' اس نے سچائی سے بتایا۔

''کیونکہ میں نے جلد ہی امید کھو دی تھی لیکن اسفند بھائی کو بہت سوچتی تھی دل ہی دل میں ان سے خفا ہوتی تھی، لڑتی تھی کہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے سائبان کا احساس دلا کر مجھے ڈھونڈا کیوں نہیں...... مجھے کیا پتا تھا کہ مجھے بہن کہنے والا دنیا سے ہی چلا گیا ہے۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''ہم نے آپ لوگوں کی تلاش کبھی چھوڑی نہیں تناشہ۔ اسفند بھائی کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی...... ہاں تعطل ضرور آتا رہا۔'' کرن کا تکیہ درست کر کے وہ اس کی طرف مڑے۔ وہ بالکل ان کے مقابل کھڑی تھی۔ آنکھوں میں چمک اور لبوں پر مدھم مسکراہٹ سجائے۔

''شاید کتابِ زندگی میں ایسا ہی لکھا تھا ہمیں اس طرح ملنا تھا آج کے ہی دن لیکن کاش بابا زندہ ہوتے، شاہ میر تایا ہوتے تو اس خوشی کا رنگ کچھ اور ہوتا...... میں نے پوری ایمان داری کے ساتھ بابا سے کیا عہد نبھانے کی کوشش کی تھی۔ پھر تم آگئیں اس میں دراڑیں ڈالنے...... میرا دل بار، بار تمہاری طرف لپکتا تھا اور میں خود کی نفی کرتے ہوئے خود کو بابا سے کیا وعدہ یاد دلاتا رہتا تھا۔ لیکن یہ دل بہت پاگل ہوتا ہے۔ مچلتا ہے، تڑپتا ہے لاحاصل کے لیے۔ میں تو تمہاری طرف

نعت نبی کریم ﷺ

دیکھوں جو ان کو آنکھیں ہوں خیرہ
ہر سو نمایاں انؐ کا ہی جلوہ
جی چاہے رکھ لوں آنکھوں میں بھر کر
کتنے معطر کتنے معطر......

لاکھوں درودوں کا ہے تاج انؐ کا
دونوں جہاں پر ہے راج انؐ کا
سب کچھ ملے گا اس در پہ آ کر
کتنا معطر...... کتنا معطر

مٹھی میں انؐ کے دونوں جہاں ہیں
سردار ہیں وہ سرورِ دو جہاں ہیں
ہیں سب سے اعلیٰ ہیں سب سے برتر
کتنے معطر کتنے معطر

محبوبِ حق ہیں نور الہدیٰ ہیں
شافعِ محشر ہیں خیر الوریٰ ہیں
صلِ علیٰ ہے انؐ کا ہی زیور
کتنا معطر...... کتنا معطر

قربت ہے انؐ کی قسمت کی دولت
دونوں جہاں میں پاؤ گے...... عزت
دیکھو تو ان کے نزدیک آ کر
کتنا معطر...... کتنا معطر

از: فریدہ ہاشمی جعفری، کراچی

نظم

تم لوٹ آؤ
ابھی موسموں میں
بہار آچکی ہے
اور پھول میری تنہائی پہ
ہنسنے لگے ہیں

افتخار شوق، میاں چنوں

اس ڈر سے دیکھتا بھی نہیں تھا کہ کہیں اس دل کے ہاتھوں ہار نہ جاؤں۔''

''بابا..... بابا!'' کرن نیند میں بڑبڑائی تھی۔

''بابا کی جان!'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف مڑے اور اس کی پیشانی چومی۔

''کرن ہماری باتوں سے ڈسٹرب ہو رہی ہے۔'' نتاشہ کی آنکھوں میں بھی نیند کا خمار تھا۔

''او کے۔'' تیمور نے اس کی خمار آلود آنکھوں کو دیکھا اور شب بخیر کہہ کر چلے گئے۔

اگلی صبح بہت نکھری ہوئی اور روشن تھی یا انہیں لگ رہی تھی۔ انہوں نے ناشتا کرتے ہوئے کئی بار نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ نتاشہ، تنویر چاچو کی باتیں سنتے ہوئے چھوٹے، چھوٹے لقمے بنا کر کرن کو کھلا رہی تھی اور اس کے چھوٹے، چھوٹے سوالوں کے جواب بھی دیتی جاتی تھی۔ ایک روز انہوں نے دعا کی تھی کہ کاش کچھ ایسا ہو جائے کہ باقی ماندہ زندگی کی ہر صبح وہ ایسا ہی منظر دیکھیں..... اور اللہ نے ان کی دعا سن لی تھی۔ کرن کو ناشتا کروا کے ٹشو سے اس کا منہ صاف کر کے اس نے تنویر چاچو اور ان سے پوچھا۔

''چائے بناؤں آپ کے لیے؟''

''ہاں بغیر چینی کے۔'' وہ مسکرائے تھے۔

''اور میری چائے میں دو چمچ۔'' تنویر چاچو بھی بے حد خوش لگ رہے تھے اور تب ہی فون کی بیل ہوئی، مہراں نے آکر بتایا۔

''کوئی خاتون ہیں آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

''مجھ سے کوئی خاتون؟'' وہ حیران ہوئے اور اٹھ کر فون اسٹینڈ کی طرف بڑھے۔ دوسری طرف جو خاتون بول رہی تھیں انہوں نے بتایا کہ وہ صوفی صاحب کی بہن ہیں۔

''بیٹا آپ نے کہا تھا کہ کبھی صبا بہن کے متعلق کچھ پتا چلے تو بتایئے گا۔''

''جی.....!'' انہوں نے مڑ کر نتاشہ کی طرف دیکھا اور کہنے ہی لگے تھے کہ اب ضرورت نہیں کو ہر مقصود مل چکا لیکن دوسری طرف خاتون کی بات سن کر حیران رہ گئے۔ وہ خاتون کہہ رہی تھیں۔

''صبا بہن کل کسی کام سے لاہور آئی تھیں تو مجھے ملنے آگئیں۔ میں نے روک لیا ہے۔ آپ کا بتایا تو تب سے بے چین ہو رہی تھیں آپ سے بات کرنے کو یہ بات کرلیں آپ۔'' دوسری طرف صبا آنٹی جانے کیا کہہ رہی تھیں وہ جیسے سن ہی نہیں رہے تھے۔ حیرت اس قدر تھی کہ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ صبا آنٹی کی آواز سن رہے ہیں۔

''ازمیر بھائی کیسے ہیں؟ بیٹا کیا وہ پاکستان میں ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں ابھی چند دن لاہور میں ہی ہوں۔ آپا کی طرف کیا آپ اور ازمیر بھائی مجھ سے ملنے آسکتے ہیں؟'' لہجے میں التجا تھی اور آواز میں آنسوؤں کی نمی۔

''نتاشہ.....'' حیرت کی کیفیت سے باہر نکل کر انہوں نے نتاشہ کو آواز دی۔

''نتاشہ، صبا آنٹی ہیں..... وہ زندہ ہیں.....''

رات کو نتاشہ نے خود پر گزری ہر بات بتائی تھی اور نتاشہ تو جیسے اڑتی ہوئی ان کے قریب آئی تھی اور ریسیور ان کے ہاتھ سے لیا تھا۔

''اماں..... میں نتاشہ..... آپ کی تاشی..... آپ کہاں گم ہو گئی تھیں..... میں نے خط لکھا رابی کو..... فون کیا۔'' بے ربط سا بولتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔

''رابعہ لوگوں نے گھر بدل لیا تھا۔'' انہوں نے بتایا۔

اور اللہ جب مہربان ہوتا ہے تو بگڑے کام سنوار دیتا ہے اور بچھڑوں کو ملا دیتا ہے اور اللہ ان پر مہربان ہو گیا تھا۔ صبا آنٹی، رابعہ کی شادی کی شاپنگ کے لیے ان کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ وہ نتاشہ اور کرن کو لے کر صبا آنٹی کو لینے لاہور چلے گئے تھے اور تنویر علی گاؤں اسما کو لینے۔

''اماں کے آتے ہی تمہاری اور نتاشہ کی شادی کر دوں گا۔ اسما یہاں رہ کر شادی کی تیاری کرے گی صبا بھابی کے ساتھ مل کر۔'' انہوں نے جاتے ہوئے کہا تھا۔

''اور دادا جان کیا انہیں بتائیں گے آپ صبا آنٹی اور ثناشہ کے متعلق؟'' تیمور علی نے پوچھا تھا۔

''وہ تمہیں شاہ میر بھائی کی بیٹی سے شادی کی اجازت دے چکے ہیں شاید انہیں خیال ہوگا کہ وہ لوگ کبھی نہیں ملیں گے تو اب منع نہیں کر سکتے، تمہیں اس شادی سے اور مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے اب تک انہیں خبر ہو چکی ہوگی۔ صبح فجر کے بعد ہی چھوٹی آپا کا فون آیا تھا۔ وہ بے یقین تھیں، میں نے یقین دلا دیا۔''

اور پھر ازمیر علی کے اس گھر میں بہاریں اتر آئیں۔ چراغاں ہوا...... شادیانے بجے...... اور ثناشہ شاہ میر، تیمور ازمیر علی کی زندگی میں شامل ہوگئی۔

تنویر علی بوکھلائے، بوکھلائے سے سب سے کہتے پھر رہے تھے۔ ''مجھ پر دُہری ذمے داریاں ہیں لڑکی والا بھی میں ہوں اور لڑکے والا بھی۔'' تب ڈاکٹر داؤد نے اعلان کیا کہ لڑکے والے وہ ہیں۔ تیمور کی بارات ان کے گھر سے آئے گی لیکن بڑی پھپھو نے ان سے التجا کی یہ ذمے داری انہیں دی جائے۔ دادا جان خاموش اور سنجیدہ تھے کہ تنویر علی انہیں اپنا فیصلہ سنا چکے تھے اور جب امان اللہ نے قرآن کے سائے میں ثناشہ کو رخصت کیا تو وہ حیرت سے اسے تکتے تھے۔

''یہ...... یہ تو شاہ میر کی کاپی ہے، کون ہے یہ...... کیا یہی تنویر کا لے پالک ہے؟'' اور بڑی پھپھو نے آہستگی سے کہا تھا۔

''شاہ میر بھائی کا بیٹا ہے ابا جان۔ مارنے والے سے بچانے والا قوی ہے۔ جس نے اغوا کیا تھا۔ شاید پولیس کے ڈر سے اس نے تاوان کا مطالبہ نہیں کیا اور اس یتیم خانے میں بچے کو چھوڑ گیا جہاں تنویر بھائی بچہ لینے گئے تھے۔''

تنویر علی نے اپنے باپ کا بھرم رکھ لیا تھا۔ اس لیے تیمور نے کسی کو حقیقت نہیں بتائی تھی۔ دولھا بنے تیمور اور دلہن بنی ثناشہ سمیت سب ہی نے ازمیر، شاہ میر...... اسفند اور آمنہ کو یاد کرکے آنسو بہائے تھے۔ تیمور، ثناشہ کو رخصت کروا کے بڑی پھپھو کے گھر لائے تھے کہ یہ ان کی خواہش تھی اور ڈاکٹر داؤد نے ان کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ ولیمے کی تقریب گاؤں میں ایک دن بعد رکھی گئی تھی کہ وہ شمشیر علی کا اکلوتا پوتا تھا۔ اسفند کے وقت بھی ان کی خواہش تھی کہ ولیمہ گاؤں میں ہو لیکن ازمیر نہیں مانے تھے لیکن اب تیمور نے ان کا مان رکھ لیا تھا اور تنویر علی نے باپ کے ہی کہنے پر امان کے لیے سبین کا رشتہ مانگ کر ان کا مان بڑھا دیا تھا۔

''اس طرح تم لوگوں کا تعلق پاکستان سے جڑا رہے گا ورنہ شاید تم کبھی پھر پاکستان نہ آؤ۔''

وہ بے حد دل شکستہ اور ہارے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ وہ ازمیر علی کے والد تھے اور تیمور جانتے تھے کہ بابا ان سے کتنی محبت کرتے تھے وہ انہیں...... بے سکون اور بے چین نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے ثناشہ کو تذبذب میں دیکھ کر سمجھایا۔

''سبین دل کی بری نہیں ہے ثناشہ...... اکلوتی اور لاڈلی ہونے کی وجہ سے تھوڑی ضدی اور خودسر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ امان کو کبھی مایوس نہیں کرے گی۔ تمہارے ساتھ اس نے جو زیادتی کی وہ دراصل مجھ پر سب کے بار، بار کہنے سے اپنا حق سمجھنے لگی تھی۔ وہ اس کے دل کا معاملہ تھا اور دل کے معاملات بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ برا بھلا سب بھول جاتا ہے انسان...... اب مجھے بھی تو دیکھو میرا دل بھی تو تمہیں دیکھ کر...... بے ایمان ہوگیا تھا۔'' وہ شوخ ہوئے تھے۔

''پھر بھی اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو تنویر چاچو اور امان تمہاری رائے کا احترام کریں گے۔''

''جب سب راضی ہیں تو میں کیوں منع کروں گی۔ اماں بھی خوش ہیں کہ بابا کی روح بہت خوش ہوگی اس رشتے سے۔'' دل میں وہ اب بھی سبین سے تھوڑی خوف زدہ سی تھی۔

''اور تم اسے دل سے معاف کردو ثناشی۔ یہ سوچ کر کہ ہمارا ملن اس کی وجہ سے ہی ہوا ورنہ جانے کب تک تمہارے کھوج میں ہم پاؤں لہولہان کرتے رہتے۔''

''تمہارے کھوج میں اپنا کمال کھو بیٹھے۔''

انہیں اچانک ہی اس روز کی پڑھی ہوئی غزل کے شعر یاد آ گئے تھے۔

''کوئی نہ کوئی زیاں ساتھ، ساتھ تھا اپنے
خوشی کو ڈھونڈ کے لائے ملال کھو بیٹھے''

وہ گنگنائے تو ثناشہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''یہ شعر وشاعری سے بھی دلچسپی ہے آپ کو؟''

''تھی تو نہیں لیکن جب ایک مجسم غزل سامنے ہو تو خود بخود ہو جاتی ہے شاعری سے دلچسپی۔'' وہ ہنسے لیکن پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئے۔

''تم نے بتایا نہیں پھر کہ تم نے سین کو معاف کر دیا ہے یا نہیں۔ تمہارا اس سے جو رشتہ بننے جا رہا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ دل میں پہلے سے کوئی میل نہ ہو۔''

''میں نے تو تب ہی معاف کر دیا تھا انہیں۔'' وہ بھی سنجیدہ تھی۔

''ایسے منہ بنا کر کہو گی تو میں پھر منع کر دیتا ہوں چاچو کو، ویسے یہ تمہارے مان بھائی ہیں ناں ان کو بھی میں نے چپکے، چپکے سین کو آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغام دیتے دیکھا ہے اور دوسری طرف بھی چہرے اور آنکھوں میں حیا کے رنگ بکھرتے دیکھے ہیں جو کہ میں کم از کم سین سے توقع نہیں کرتا تھا۔''

''آپ بھی ناں، فضول اندازے لگا رہے ہیں۔ میں نے اسی روز معاف کر دیا تھا کہ وہ یہ سب آپ کو پانے کے لیے کر رہی تھی اور آپ کو پانے کے لیے کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''یعنی کہ آپ بھی...... ذرا پھر سے کہنا، کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ جو لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز تھے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

''ہماری جھولی میں بھی تو کچھ اظہار کے موتی ڈال کر مالا مال کر دو ہمیں......''

''بابا!'' تب ہی کرن نے لاؤنج میں آ کر بلایا تھا۔

''آپ کو دادا ابو بلا رہے ہیں۔''

اور وہ ثناشہ پر ایک پیار بھری نظر ڈالتے ہوئے چلے گئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ امان کا نکاح بھی کر دیا جائے ان تین چار دنوں میں پھر امان، تنویر علی اور اسما چلے جائیں اپنے پروگرام کے مطابق...... ثناشہ اور صبا، تیمور کے ساتھ یہاں ہی رہیں گی جب تک کاغذات نہیں بن جاتے...... اتنے میں سین کے پیپرز بھی تیار ہو جائیں گے وہ جب امان کی شادی کے لیے آئیں گے تو سب ساتھ ہی چلے جائیں گے۔ دادا جان خاموش ہی رہے تھے انہوں نے تنویر علی کو بھی یہاں رکنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ زمین جائداد جس کے لیے انہوں نے کتنے دل دکھائے تھے۔ اس زمین سے ان کے وارثوں کو کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ اسے چھوڑ کر ایک اجنبی ملک میں بسنے جا رہے تھے اور ان کے پاس صرف پچھتاوے تھے۔

''ہم سال میں ایک بار چھٹیوں میں ضرور آیا کریں گے اور یہاں آپ کے پاس حویلی میں رہیں گے۔'' تیمور علی نے وعدہ کیا تھا اور انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا بھی تھا کہ وہ وعدہ نبھانا جانتے تھے۔

☆☆☆

چھ سال بعد

لاہور ائرپورٹ پر حسبِ معمول گہما گہمی تھی۔ ثناشہ گود میں دو سال کے بچے کو لیے لاؤنج میں بیٹھی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ پاس ہی کرن ہاتھ میں اس کا سیل فون لے کر کوئی گیم کھیل رہی تھی حسبِ معمول اس کے سوالوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

''اگر ان کے گھر میں کیمرے لگے ہوتے تو وہ جنہوں نے آپ کو قید کیا تھا۔ انہیں سب پتا چل جاتا ماما۔ اور پھر وہ ان کو بھی سزا دیتے جنہوں نے آپ کی مدد کی تھی۔''

اس بار جب وہ دادا جان سے ملنے آئے تھے تو تیمور نے گھر میں کیمرے لگوائے تھے۔

''ہاں بیٹا......!''

''اور اگر تب یہ ٹچ فون اور انٹرنیٹ ہوتا تو دادا ابا آپ کو اور ثنا کو فوراً ڈھونڈ لیتے...... ہیں ناں!''

اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ٹچ فون ابھی دو سال پہلے ہی متعارف ہوا تھا۔

digest novels lovers group

تب صرف بٹنوں والے فون تھے وہ بھی کسی، کسی کے پاس۔ کرن گھر میں ہونے والی بات چیت سے الجھن میں پڑ جاتی تھی تب اس نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے مختصراً اسے بتا دیا تھا کہ کیسے حادثے میں وہ گم ہو گئی تھی۔ وہ ہر سال چھٹیاں گاؤں میں دادا جان کے پاس گزارتے تھے۔ دادا جان کی طبیعت اس بار کچھ ناساز تھی اس لیے تنویر چاچو اور اسما چچی رک گئی تھیں جبکہ تیمور کی چھٹی ختم ہو گئی تھی اس لیے وہ واپس جا رہے تھے...... اس نے تیمور کو دیکھنے کے لیے ادھر اُدھر نظر دوڑائی وہ بچوں کے لیے جوس اور چپس لینے گئے تھے اور اپنے لیے کافی...... تب ہی اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو کسی کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا لاؤنج میں آ رہا تھا...... چند لمحوں بعد ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"خیر دین......" اور وہ بے ارادہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ذرا بھائی کو پکڑو کرن......" اس نے بچے کو کرن کے حوالے کیا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور کچھ فاصلے پر رک کر آواز دی۔

"خیر دین چاچا......"

خیر دین نے مڑ کر دیکھا۔ وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے شخص کے کان میں جھک کر کچھ کہا اور پھر وہیل چیئر وہاں ہی چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔

"آپ...... آپ زندہ ہیں......؟"

"زندگی دینے اور لینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے چاچا...... اور اللہ نے مجھے بچا لیا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"میں آپ کے اس احسان کا بدلہ تو کبھی نہیں چکا سکی لیکن میں نے اپنی دعاؤں میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھا۔ ہر نماز کے بعد آپ کی آسانیوں کے لیے دعا کی۔"

"بہت شکریہ......" وہ ممنون ہوا تھا۔

"شاید یہ آپ کی دعاؤں کی وجہ سے ہی ہے کہ میری زندگی میں آسانیاں پیدا ہوئیں اور پریشانیاں دور ہو گئیں۔"

"اور یہ کون ہے؟" اس نے وہیل چیئر پر بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کیا جس کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔

"باس ہیں......"

"کیا ہوا ہے انہیں؟"

"مکافاتِ عمل......" خیر دین نے ایک گہری سانس لی۔ "دو سال پہلے فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ بی پی بہت ہائی رہتا تھا۔ اور دوا وغیرہ نہیں لیتے تھے تو...... شاید کسی معصوم لڑکی کی آہ لگ گئی ہے۔ اللہ نے آپ کو بچا لیا ورنہ انہوں نے اسپتال میں آپ کو ڈھونڈتی آپ کی والدہ اور ان کے عزیز کو بتایا تھا کہ آپ کی لاش مسخ ہو گئی تھی، دفنا دی گئی اور آپ کو ان کی موت کا بتا کر گویا آپ کے پلٹنے کے سارے راستے بند کر دیے تھے۔ لیکن آپ کے والدین کی کوئی نیکی کام آ گئی اور آپ اپنوں میں پہنچ گئیں۔"

تب ہی اسے تیمور ہاتھ میں کافی کے کپ اٹھائے آتے نظر آئے تو وہ خیر دین کو خدا حافظ کہہ کر دعا میں لے کر بچوں کے پاس چلی آئی جہاں کرن، اب بھائی کو چپس کھلا رہی تھی۔

"کہاں گئی تھیں تاشہ......؟" تیمور علی نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کافی کا کپ اسے پکڑایا۔

"ایک محسن نظر آ گئے تھے ان کا شکریہ ادا کرنے گئی تھی اگر اللہ ان کے دل میں رحم نہ ڈالتا تو آج شاید زندگی کا یہ رنگ نہ ہوتا شاید۔"

"شاید میں تمہیں کھوجتے، کھوجتے تھک کر مٹی اوڑھ لیتا۔" اس نے خفگی سے انہیں دیکھا تو تیمور علی نے فوراً سوری کیا۔

"پھر تو خیر دین چاچا کو میرا بھی شکریہ کہنا بنتا ہے۔" انہیں اس کی بتائی باتوں کا ہر، ہر لفظ یاد تھا۔

"میں نے کہہ دیا، آپ نے کہہ دیا ایک ہی بات ہے۔"

"ہاں بات تو ایک ہی ہے — من تو شدم تو من شدی"

اسے اپنی نظروں میں سموئے لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ گھونٹ، گھونٹ کافی پینے لگے تھے۔

(ختم شد)